

انتخابات بان اردو

الموسم

توکب اردو

محمد امجد علی

سابق مدرس فارسی گورنمنٹ سنٹرل نارمل اسکول آگرہ

CH. 1996

جناب صاحب ڈاکٹر مہار سیر شہ تعلیم

صوبہ بجات متحدہ آگرہ داود

برائے درس جماعت کے پرنسپل یعنی ہفتم و ششم اینگلو ورنیکولر اسکول

باہتمام کیسری داس سیٹھ پرنسپل

Checked
1987

نول کشور پریس

حضرت گنج لکھنؤ

کاپی رائٹ پرنس انڈیا اور ملکات نظام دکن میں عام و تلف محفوظ ہے

۱۹۸۷ء

To
THOMAS ROWLAND WYER, Esq., B.A., J.P.,

Officiating Commissioner, Rohilkhand Division,

FORMERLY MAGISTRATE & COLLECTOR, MEERUT,

**who has given an impetus to HIGHER EDUCATION in
the Meerut Division by founding a College
at its Head-quarters**

AND

Who has Organized, Expanded and Improved

THE MIDDLE & PRIMARY EDUCATION

IN

SOME OF THE DISTRICTS OF THE DIVISION.

REC'D 1990
THIS BOOK IS INSCRIBED

**As a mark of Admiration for his Indefatigable Labours and
Vast Sympathy for the Natives.**

BY

THE COMPILER.

Lucknow:

PRINTED BY K. D. SETH AT THE NEWUL KISHORE PRESS,

1924.

دیباجہ

زبان اردو کی کم مانگی مسلم ہی سی۔ تو بھی یہ غدر انتخاب کی ذمہ داریوں سے ہم کو
چنداں سبکدوش نہیں کرتا۔ جو سبق طلبہ کے درس و مطالعہ کے لئے پیش کیے جائیں
وہ بالضرور فصاحت و بلاغت میں کامل عیار۔ ادب و اخلاق کی میزان میں سنجیدہ
و لاؤیزی و شگفتگی کے آب و نمک سے بامزہ ہونے چاہئیں۔

کامیابی کا دعویٰ تو نہیں مگر ہم نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ مضامین منتخبہ
میں حسن ظاہر کے ساتھ معنوی پاکیزگی بھی ضرور ہو۔ زبان دانی بیشک ایک جوہر ہے مگر جس
زبان سے قوائے روحانی مفعول ہو جائیں۔ اُس سے تو بے زبانی ہی برابر بہتر ہے۔
نثر اردو نے نظم سے بہت پیچھے رواج پایا ہے۔ اُس کی ابتدا فقہ کما نیوں سے
ہوئی اور تھوڑا ہی زمانہ گزرا تھا۔ کہ تمتع اور تکلف نے اُس کو بیکار محض کر دیا۔
مگر مرزا غالب مرحوم کی تحریرات سادہ و سرسری نے اُس کا قدرتی حسن دکھایا پھر
سرسید مرحوم اور اُن کے مقلدین نے مغربی خیالات کی جان ڈال کر اُس میں
مہذب زبانوں کی سی آن و ادا پیدا کر دی۔ اگرچہ قابل انتخاب قریب تر زمانہ کی نثر
ہے۔ مگر ہم نے مشاہیر قدیم و جدید سب کے کلام کا نمونہ لیا ہے۔ تاکہ طلبہ کو
مختلف اسالیب بیان سے واقفیت حاصل ہو۔

اصنافِ نظم میں تو ہمارے شعراء سخن سخن نے شیوا بیانی اور آتش زبانی
کی دھوم مٹت سے مچا رکھی ہے اور ریختہ کو رشک پارسی بنانے میں کسر
نہیں چھوڑی لیکن اس سہمیائی باغ میں سے ایسے گل پھول چٹا جو نوخیز طبع کو
آشفہ اور جذباتِ نفسانی کے بھوت کو بیدار نہ کر دیں۔ سخت مشکل کام ہے۔ بارے
ہم نے اس طلسم کدہ میں چھونک چھونک کر قدم رکھا اور اساتذہ ماضی و حال کے
پاکیزہ کلام کے اس مجموعہ کو زیب و زینت دی۔ امید ہے کہ اس انتخاب کے مطالعہ
سے مہارت زبان دانی کے علاوہ طلبہ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اردو کی نظم و نثر نے ایک
صدی سے زیادہ عرصہ میں کیا کیا منزلیں اپنی ترقی کی طے کی ہیں۔ مارچ ۱۹۹۰ء

محمد اسماعیل

فہرست مضامین توڑک اُرووۄ حصہ شہر

صفحہ	مضمون	نمبر شمار
۱	سوزنیشن - از سر سید احمد خاں مرحوم	۱
۷	عزت	۲
۹	موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ - از نواب محسن الملک سید ہمدی علی خاں	۳
۱۷	زبانِ گویا - از خواجہ الطاف حسین حالی	۴
۲۰	حیاتِ سعدی	۵
۲۸	ریاضتِ جہانی - از شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب	۶
۳۲	عقل کی نارسائی	۷
۳۷	کارخانہ قدرت	۸
۴۳	قسطینہ کے مختصر حالات - از شمس العلما مولانا شبلی نعمانی	۹
۴۹	مصر کی قدیم یادگاریں -	۱۰
۵۲	بزمِ قدرت - از مولوی عبدالحلیم شہر	۱۱
۵۵	دارنِ ہیسٹنگز کے اخلاق و عادات - از شمس العلما مولوی محمد ذکا اللہ	۱۲
۵۸	ادب	۱۳
۶۰	حیا	۱۴
۶۲	محنت	۱۵
۶۴	ادوارِ انگریزی انشا پر داری پر کچھ خیالات از شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد	۱۶
۶۹	تذکرہ ملک الشعراء قافی ہند شیخ ابراہیم ذوق	۱۷
۷۷	خط ۱-۱۱ - مرزا اسد اللہ خاں غالب	۱۸
۸۶	جنگ مرہٹہ و درانی - از مولف	۱۹
۹۳	جاڑے کی شدت - از مرزا جب علی بیگ متروور	۲۰
۹۶	قصہ - از میرامن دہلوی -	۲۱

حصہ نظم

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۵۰	شیخ قلندر بخش جرأت		منویات
۵۲	سید انشاء اللہ خاں - انشاء		
۵۵	شیخ غلام بہرائی - مصحفی	۱	حب وطن - از خواجہ الطاف حسین حالی
۵۸	میر محمد تقی - پیر	۵	برکھارت " " "
۶۱	مرزا رفیع سودا	۶	از مثنوی میر حسن دہلوی
۶۴	خواجہ میر درد	۱۳	از مثنوی گلزار نسیم
	قصائد	۲۰	از مثنوی میر تقی
۶۶	امیر الشعرا منشی امیر احمد امیر مینائی		غزلیات
۶۹	شمس العلماء مولوی میر احمد	۲۲	صبح الملک نواب مرزا خاں دلخ و دہلوی
۷۰	حکیم مومن خان مومن	۲۵	امیر الشعرا منشی امیر احمد امیر مینائی
۷۲	مرزا اسد اللہ خاں غالب	۲۷	از مؤلف
۷۳	شیخ ابراہیم ذوق	۳۰	سراج الدین محمد - بہادر شاہ - ظفر
۷۶	خواجہ الطاف حسین حالی	۳۳	شیخ ابراہیم ذوق
۷۸	قطعات	۳۶	حکیم مومن خان مومن
۸۲	مسدسات	۳۹	نواب مصطفیٰ خاں شیعقہ
۸۹	مشمق - کیفیت قلعہ اگرہ	۴۲	مرزا اسد اللہ خاں غالب
۹۷	رباعیات	۴۵	خواجہ حیدر علی آتش
		۴۸	شیخ امام بخش نانخ

بِسْمِ اَہْدِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
 ماکر کتب دہلی دفاکٹر
 حصہ نثر

انریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں کے سی۔ ایس۔ آئی۔ ایل ایل۔ بی

ولادت ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء وفات ۲۷ مارچ ۱۸۹۷ء سر سید نے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم مسلمانان کی بنیاد ڈالی۔ انہارنٹینیوٹ گزٹ اور رسالہ تہذیب الاخلاق دونوں اُن کی ایڈیٹری میں نکلتے تھے۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سب سے زیادہ مشہور تفسیر القرآن ہے۔ چھ جلدوں میں انکا طرزِ تحریر سادگی و روانی و دشمنی میں مشہور ہے۔ مختلف نام کو نہ تھا مشکل سے مشکل مضمون کو اس خوبی سے بیان کرتے کہ گویا پانی کر کے بہا دیتے تھے۔ غرض ۱۸۷۷ء کے بعد اردو زبان کے علم ادب میں جو انقلاب پیدا ہوا اور انگریزی لکچر کا پرتو اُس پر پڑا وہ زیادہ تر سر سید ہی کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس لئے اُن کو جدید علم ادب کا بانی کہہ سکتے ہیں۔

سولریشن یا تہذیب (از تہذیب الاخلاق)

ہم دریافت کیا چاہتے ہیں کہ سولریشن کیا چیز ہے۔ اور کن کن چیزوں سے علاقہ رکھتی ہے؟ کیا یہ کوئی بنائی ہوئی چیز ہے یا قدرت نے انسان کی فطرت میں اس کو پیدا کیا ہے؟ اسکے معنی کیا ہیں؟ کیا یہ کوئی اصطلاح ہے؟ جسے لوگوں نے یا فیلسوفوں نے مقرر کیا ہے۔ یا ایسی چیز ہے کہ اُس کا مفہوم اور جن جن چیزوں سے اُس کا تعلق ہے۔ وہ قانون قدرت میں پایا جاتا ہے اس امر کے تصفیہ کے لئے ہم کو انسانی حالات پر نظر کرنی چاہیے۔ اگر تہذیب انسان میں ایک فطری چیز ہے۔ تو وحشیوں میں

شہریوں میں سب میں اُس کا نشان ملے گا۔ گو اُس کی صورتیں مختلف دکھائی دیتی ہوں الا سب کی جڑ ایک ہی ہوگی۔

انسان میں یہ ایک فطری بات ہے کہ وہ اپنے خیال کے موافق کسی چیز کو پسند کر لے گا اور کسی کو ناپسند یا یوں کہو کہ کسی چیز کو اچھا ٹھہراتا ہے اور کسی کو بُرا۔ اور اُس کی طبیعت اس طرف مائل ہے کہ اُس بُری چیز کی حالت کو ایسی حالت سے تبدیل کر لے جس کو وہ اچھا سمجھتا ہے۔ یہی سولوشن کی جڑ ہے۔ جو انسان کے ہر گروہ میں اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے اسی تبادلہ کا نام سولوشن یا تہذیب ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ یہ میلان یا یہ خواہش مبادلہ انسان میں قدرتی ہے۔

سولوشن یا تہذیب کی طرف انسان کی طبیعت کے مائل ہونے کے دو اصول ٹھہرے۔ اچھا اور بُرا۔ اور بُرے کو اچھا کرنا سولوشن یا تہذیب ٹھہری۔ مگر اچھا اور بُرا قرار دینے کے مختلف اسباب خلقی اور خلقی۔ ملکی اور تمدنی ایسے ہوتے ہیں جن کے سبب اچھا اور بُرا ٹھہراتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ قوموں کی سولوشن میں اختلاف پڑ جاتا ہے ایک قوم جس بات کو اچھا سمجھتی ہے اور داخل تہذیب جانتی ہے دوسری قوم ایسی بات کو بہت بُرا اور وحشیانہ حرکت قرار دیتی ہے۔ یہ اختلاف سولوشن کا قوموں کے باہم ہوتا ہے اشخاص میں نہیں ہوتا یا بہت ہی کم ہوتا ہے *۔

جب کہ ایک گروہ انسانوں کا کسی جگہ اکٹھا ہو کر رہتا ہے تو اکثر انکی

ضرورتیں اور اُن کی حاجتیں۔ اُن کی غذائیں اور اُن کی پوشاکیں۔ اُن کی معلومات اور اُن کے خیالات۔ اُن کی مسرت کی باتیں اور اُن کی نفرت کی چیزیں۔ سب کیاں ہوتی ہیں۔ اور اسی لئے بُرائی اور اچھائی کے خیالات بھی سب میں کیاں پیدا ہوتے ہیں۔ اور بُرائی کو اچھائی سے تبدیل کرنے کی خواہش سب میں ایک سی ہوتی ہے۔ اور یہی مجموعی خواہش تبادلہ یا مجموعی خواہش سے وہ تبادلہ اُس قوم یا گروہ کی سولیشن ہے۔ مگر جب کہ مختلف گروہ مختلف مقامات میں بستے ہیں تو اُن کی حاجتیں اور خواہشیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ اور اس سبب سے تہذیب کے خیالات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ مگر ضرور کوئی ایسی چیز بھی ہوگی کہ جو سولیشن کی اُن مختلف حالتوں کا تصفیہ کر سکے۔

ملکی حالتیں جہاں تک کہ وہ بود و باش سے تعلق رکھتی ہیں۔ نہ فکر و خیال و دماغ سے اُن کو تہذیب سے چندان تعلق نہیں بلکہ صرف انسان کے خیال کو اُس سے تعلق ہے۔ جس کے سبب وہ اچھا اور بُرا ٹھہرتا ہے اور جس کے باعث سے خواہش تبادلہ تحریک میں آتی ہے۔ اور وہ تبادلہ واقع ہوتا ہے جو سولیشن کہلاتا ہے پس سولیشن کی مختلف حالتوں کا فیصلہ وہ اسباب کر سکتے ہیں۔ جنکے سبب سے اچھے اور بُرے کا خیال دل میں بیٹھتا ہے۔

خیال کی درستی اور پسند کی صحت کثرتِ معلومات اور علمِ طبیعیات سے بخوبی ماہر ہونے پر منحصر ہے۔ انسان کی معلومات کو روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے اور اُس کے ساتھ ساتھ سولیشن بھی بڑھتی ہے۔ کیا عجب ہے؟

کہ آئندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ انسان کی تہذیب میں ایسی ترقی ہو کہ اس زمانہ کی تہذیب کو بھی لوگ ایسے ہی ٹھنڈے دل سے دیکھیں جیسے کہ ہم اپنوں سے اگلوں کی تہذیب کو ایک ٹھنڈے مگر مؤدب دل سے دیکھتے ہیں۔

تہذیب یا یوں کہو کہ بری حالت سے اچھی حالت میں لانا دنیا کی تمام چیزوں سے اخلاقی ہوں یا مادی کی کیا تعلق رکھتا ہے۔ اور تمام انسانوں میں پایا جاتا ہے۔ تکلیف سے بچنے اور آسائش حاصل کرنے کا سب کو کیا خیال ہے۔ ہنر اور اس کو ترقی دینا تمام دنیا کی قوموں میں موجود ہے۔ ایک تربیت یافتہ قوم زرد و جاہریا قوت و الماس سے نہایت نفیس نفیس خوبصورت زیور بناتی ہے۔ ناتربیت یافتہ قوم بھی کوڑیوں اور پوتھوں سے اپنی آرائش کا سامان ہم پہنچاتی ہے۔ تربیت یافتہ قومیں اپنی آرائش میں شو نے چاندی موگے اور موتوں کو کام میں لاتی ہیں۔ ناتربیت یافتہ قومیں جانوروں کے خوبصورت اور زین پرلوں کو تیلیوں پر سے چھلے ہوئے سنہری پوست اور زرد کے سے رنگ کی باریک اور خوشنما گھاس میں گوندھ کر اپنے تئیں آراستہ کرتی ہیں۔ تربیت یافتہ قوموں کو بھی اپنے لباس کی درستی کا خیال ہے۔ ناتربیت یافتہ بھی اس کی درستی پر مصروف ہیں۔ شاہی مکانات نہایت عمدہ اور عالی شان بنتے ہیں اور نفیس چیزوں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ناتربیت یافتہ قوموں کے جھونپڑے اور ان کے رہنے کے گھونپے درختوں پر باندھے ہوئے ٹانڈرین

میں کھودی ہوئی کھوئیں بھی تہذیب سے خالی نہیں۔ معاشرت کی چیزوں
مردن کے قاعدے عیش و عشرت کی مجلسیں۔ خاطر و مدارات کے کام اخلاق
و محبت کی علامتیں دونوں میں پائی جاتی ہیں۔

علمی خیالات سے بھی ناتربیت یافتہ قومیں خالی نہیں۔ بلکہ بعض چیزیں
ان میں زیادہ اصلی اور قدرتی طور سے دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً شاعری جو
ایک نہایت عمدہ فن تربیت یافتہ قوموں میں ہے ناتربیت یافتہ قوموں
میں عجیب عُمَدگی و خوبی سے پایا جاتا ہے۔ یہاں خیالی باتوں کو ادا
کیا جاتا ہے۔ وہاں دلی جو شوں اور اندرونی جذیوں کا اظہار ہوتا
ہے۔ موسیقی نے تربیت یافتہ قوموں میں نہایت ترقی پائی ہے۔
مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں بھی عجیب کیفیت دکھائی ہے اُن کی
ادا اور آواز کی ٹھہرت۔ اُس کا گھٹاؤ اور اُس کا بڑھاؤ اُس کا ٹھہراؤ
اور اُس کی اُچھ۔ ہاتھوں کا بھاؤ اور پانوں کی دھمک زیادہ تر
مصنوعی قواعد کی پابند ہے۔ مگر ناتربیت یافتہ قوموں میں یہ سب
چیزیں دلی جوش کی موجیں ہیں۔ وہ لے اور تال اور راگ رنگنی کو نہیں
جانتے مگر دل کی لہ اُن کی لے۔ اور دل کی ٹھہر اُن کا تال ہے۔ اُن کا
غول بانہ کہ کھڑا ہونا طبعی حرکت کے ساتھ اچھلنا۔ دل کی بیتابی سے
بھلنا اور پھر جوش میں آکر سیدھا ہو جانا۔ گو تراکت اور فن ضیا گری سے
خالی ہو۔ مگر قدرتی جذیوں کی ضرورت تصویر ہے۔ دلی جذبوں کا روکنا
اور اُن کو عمدہ حالت میں رکھنا تمام قوموں کے خیالات میں شامل ہے

پس جس طرح ہم تہذیب کا قدرتی لگاؤ تمام انسانوں میں پاتے ہیں اسی طرح اس کا تعلق عقلی اور مادی سب چیزوں میں دیکھتے ہیں جس چیز میں ترقی یعنی بُرائی سے اچھائی کی طرف رجوع یا اُدغ سے اعلیٰ درجہ کی طرف تحریک ہو سکتی ہے اُسی سے تہذیب بھی متعلق ہے۔

پس سولوشن یا تہذیب کیا ہے؟ انسان کے افعال ارادی اور جذبات نفسانی کو اعتدال پر رکھنا۔ وقت کو عزیز سمجھنا۔ واقعات کے اسباب کو ڈھونڈنا اور اُن کو ایک سلسلہ میں لانا۔ اخلاق۔ معاملات معاشرت۔ طریق تمدن اور علوم و فنون کو بقدر امکان قدرتی خوبی اور فطری عمدگی پر پہنچانا اور اُن سب کو خوش اسلوبی سے برتنا۔ اس کا نتیجہ کیا ہے؟ روحانی خوشی۔ جسمانی خوبی۔ مصلیٰ کلین۔ حقیقی وقار۔ اور خود اپنی عزت کی عزت۔ اور درحقیقت یہی کچھلی ایک بات ہے جس سے حیثیات اور انسانیت میں تمیز ہوتی ہے۔

(سید احمد خاں)

عزت (از تہذیب الاخلاق)

بہت کم لوگ ہیں۔ جو اُس کی حقیقت جانتے ہوں۔ اور بہت کم ہیں جو اُس کے مشتقات کے معزز القابوں کے مستحق ہوں جس کی لوگ بہت آؤ بھگت کرتے ہیں۔ اُسی کو لوگ معزز سمجھتے ہیں اور وہ اپنے آپ کو بھی معزز جانتا ہے۔ اوصاف ظاہری بھی ایک ذریعہ معزز ہونے اور معزز بننے کا ہے جو دولت حکومت اور شہرت سے بھی زیادہ معزز بنا دیتا ہے مگر یہ اعزاز اِس سے زیادہ کچھ رتبہ نہیں رکھتا۔ جیسا کہ ایک تانبے کی مورت پر سونے کا طمع کر دیا گیا ہو۔ جب تک وہ مورت ٹھوس سونے کی نہ ہو اُس وقت تک درحقیقت وہ کچھ قدر قیمت کے لائق نہیں ہے یہی حال انسان کا ہے۔ جب تک اُس کی حالت بھی عزت کے قابل نہ ہو۔ وہ معزز نہیں ہو سکتا۔

لوگوں کو کسی انسان کی اندرونی حالت کا جاننا نہایت مشکل بلکہ قریب ناممکن کے ہے۔ پس اُن کا کسی کو معزز سمجھنا درحقیقت اُس کے معزز ہونے کی کافی دلیل نہیں ہے۔ ہاں وہ شخص بلاشبہ معزز ہے جس کا دل اس کو معزز جانتا ہو۔ معزز سمجھتا ہو جس کو انگریزی میں سیلف ریسپیکٹ کہتے ہیں۔ کوئی شخص کسی سے جھوٹی بات کو سچی بنا کر کہتا ہے۔ تو خود اُس کا دل اُس کو ٹوکتا ہے کہ بیچ نہیں ہے۔ گو سُننے والا اُس کو سچ سمجھتا ہو مگر کہنے والے کا دل گواہی دیتا ہے۔ کہ وہ جھوٹوں میں کا ایک جھوٹا اور بے عزتوں میں کا ایک بے عزت ہے۔

یہی طرح تمام افعال انسان کے۔ جو صرف ظاہری نمائش کے طور پر کیے جاتے ہیں۔ گو لوگ اُن کی عزت کرتے ہوں۔ مگر درحقیقت وہ

عزت کے مستحق نہیں ہیں۔ عزت کے لائق وہی کام ہیں۔ جن کو دل بھی قابل عزت سمجھے۔ اس لئے انسان کو انسان بننے کے لئے ضرور ہے کہ تمام اُس کے کام سچائی اور دلی شہادت پر مبنی ہوں۔ ہم کوئی بات ایسی نہ کہیں جس کو ہمارا دل جھٹلاتا ہو۔ ہم کوئی کام ایسا نہ کریں جس کی عزت ہمارا دل نہ کرتا ہو کسی سے ہم اظہار دوستی اور محبت کا نہ کریں اگر حقیقت ہمارے دل میں اُس سے ویسی ہی محبت اور دوستی نہ ہو۔ جیسی کہ اظہار کرتے ہیں۔ ہم کوئی کام ایسا نہ کریں جس کو ہمارا دل اچھا نہ سمجھتا ہو۔

صلح کل ہونا اگر اس کے معنی یہ ہوں۔ کہ سب سے اس طرح ملیں کہ ہر شخص جانے۔ ہمارے بڑے دوست ہیں۔ تو یہ تو نفاق اکبر ہے ایسا شخص نہ کسی کا دوست ہوتا ہے اور نہ کوئی اُس کا دوست ہوتا ہے اور اگر اس کے یہ معنی ہوں۔ کہ کسی سے بغض۔ عداوت اور دشمنی اپنے دل میں نہ رکھتے۔ کسی کا بُرا نہ چاہے۔ دشمن کی بھی بُرائی نہ چاہے وہ بلاشبہ تعریف کے قابل ہے۔ دل انسان کا ایک ہے اُس میں دو چیزیں یعنی عداوت (کسی کے ساتھ کیوں نہ ہو) اور محبت سما نہیں سکتی۔ وہ ایسی کھلیا نہیں ہے جس میں دو خانے ہوں۔ ایک محبت کا۔ ایک عداوت کا۔ اور اس لئے یہ دو چیزیں گوشا خاص متعدد اور حیثیات مختلفہ کے ساتھ کیوں نہ ہوں دل میں سما نہیں سکتیں۔ اس لئے انسان کو لازم ہے کہ محبت کے ہوا کسی دوسری چیز کے لانے کا دل میں خیال ہی نہ کرے۔ اور ایسی ہی زندگی انسان کے لئے عمدہ زندگی ہے۔

(سید احمد خان)

نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں شیر نواز جنگ

موجودہ تعلیم و تربیت کی شبیہ
(از تہذیب الاخلاق)

ایک روز خیال نے مجھے عالم مثال تک پہنچایا۔ اور اُس طلسم کردہ کو جہاں سب چیزوں کی شبیہ اور تمام حالتوں کی تصویرِ مصدور قدرت نے کھینچ رکھی ہے۔ دکھایا۔ درحقیقت میں نے اُسے دیا ہی پایا جیسا سنا کرتا تھا۔ بلاشبہ وہ ہماری حالتوں کا آئینہ اور ہمارے خیالوں کی تصویر کا مرقع ہے۔

جب میں اس طلسم خانہ کی مغربی جانب پہنچا۔ تو ایک چار دیواری دیکھی۔ جو میرے خیال سے بھی زیادہ بلند اور میرے حوصلہ سے بھی زیادہ وسیع اور میری ہمت سے بھی زیادہ مضبوط تھی قدرت نے ایسا سنہرا رنگ دیا تھا کہ جب سورج کی کرن اُس پر پڑتی۔ تو وہ دیوار زنگار کنڈن کی طرح چمکتی جس سے آنکھوں کو چکا چوند ہو جاتی اُس دیوار کے چاروں طرف پھرا۔ پر میں نے دروازہ نہ پایا۔ مگر ایک جگہ ایک بڑی نہر دیکھی۔ جو دیوار کے نیچے سے اندر جاتی ہے۔ اور ایک بندی پر چشمہ دیکھا۔ جس سے نہر میں پانی گرتا ہے۔

میں نے وہاں ایک رفیق پایا۔ جس کا نام خرو تھا اُس سے حقیقت اُس کی پوچھی تو اُس نے کہا کہ "اس کے اندر ایک ایسا پُر فضا

باغ ہے۔ جسے جنت عدن بھی دیکھے۔ تو شرمندہ ہو۔ اور یہ نہر اُسی کے
 شاداب کرنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ تب تو مجھے جانے کا شوق ہوا اپنے
 رہنما سے دروازہ کا نشان پوچھا۔ اور میں نے اُس کی کامل اطاعت اور بڑی
 تابعداری کی۔ تب اُس نے پانچ برس کے بعد دروازہ بتایا میں اُس
 دروازہ کی مٹھریا کی بلندی اور اُس کے طاق اور کنگرہ کی خوبی کیسا
 بیان کروں! میں جانتے ہی بے تابانہ دوڑنے لگا۔ اور باغ کی سیر سے
 سیر ہونا چاہا۔ میری اس بوالہوسی پر میرا رہنما ہنسا۔ اور کہا۔ کہ ”اے
 نادان! دروازہ تو پانچ برس کی محنت کے بعد پایا۔ اس باغ کی سیر
 کیا آسان ہے! جس کا ایک کنارہ ازل اور دوسری حد تک ہے۔“
 خیر! میں نے ہوس کو روکا۔ اور خرد نے جس چال چلایا چلا۔ کئی برس
 کے بعد چند کیاریاں اس باغ کی دیکھ پائیں۔ مگر اُن کی خوبی اور لطافت
 میرے بیان سے باہر ہے۔ ہر چہ قدرت کا کارخانہ اور صنعت کا
 تماشا تھا۔ اُس باغ کے سبزہ کا مستانہ جھومنا۔ قمری کی آواز۔ بلبلوں کا
 پھولوں پر گرنا۔ پھولوں کا کھلنا۔ کلیوں کا چٹکنا۔ نرگس کی نظربازی
 اور شمشاد کی سرو قدی نے مجھے ایسا مست کر دیا کہ اپنے ہوش و
 حواس میں نہ رہا۔

میں چندے اُس باغ میں رہا۔ پر مجھ کو اپنی صورت کا کوئی رفیق نہ ملا
 جس سے دل بہلاتا اور اُس باغ کی بہار ٹوٹتا۔ آخر اپنی تنہائی سے
 گھبرایا اور باہر نکلا۔ کہ کوئی مجھ سامنے۔ تو یہاں لاؤں اور اپنا

دل خوش کروں +

میں اس باغ سے نکل کر برسوں اسی تلاش میں پھرا لیکن کوئی نہ ملا
آخر بچہ چند سال کے مشرق کی طرف مجھے ایک چار دیواری میں نظر پڑی
جس کی صورت بھی ویسی ہی تھی۔ نہر بھی ویسی ہی اور چشمہ بھی ویسی ہی
تھا جہاں سے میں نکلا تھا۔ مگر دروازہ کھلا ہوا دیوار شکستہ اور کچھ نئی
قسم کے آدمی آتے جاتے نظر آئے۔ میں نے اپنے رہنما سے پوچھا
کہ یہ تو وہی باغ ہے۔ مگر کیا سبب ہے کہ نہ دیوار کی وہ خوبی و خوشنمائی ہے
نہ دروازہ کی وہ رفعت و شان۔ چشمہ بھی میلا نظر آتا ہے۔ پانی کی
بھی صورت بدلی ہوئی ہے؟ اُس نے کہا۔ کہ یہ وہ باغ نہیں ہے۔ دھرا
ہے۔ پہلے اسی باغ کی طرح آراستہ تھا۔ خزاں کی ہول نے اس کو سکھا دیا
اور زمانے کے انقلاب نے پامال کر دیا۔

جب میں باغ کے اندر گیا۔ تو چمن کے نشان کچھ نظر آئے۔ مگر یہ وہ
صفائی۔ نہ وہ خوبی۔ نہر میں بھی کچھ بہتی معلوم ہوئیں۔ مگر نہ پانی کی وہ
لطف۔ نہ وہ شیرینی۔ پھول جتنے تھے سب کھلائے ہوئے۔ میوے
جس قدر تھے۔ وہ سوکھے پڑے ہوئے۔ سبزہ کے زمروں رنگ پر سیاہی
چھائی ہوئی تھی، گلؤں کی سُرخ پر زردی آگئی تھی۔ نسیم کے بدلے صحر
کی تندہی پریشان کرتی تھی۔ بلبلوں کی جگہ زاغ و زغن کا شور ہو رہا تھا،
نرگس اپنی پھوٹی آنکھ سے حیرت کی نگاہ کر رہی تھی۔ حوض کی آنکھ بھی خشکی
پر دروہ رہی تھی۔

میں باغ میں پھرتے پھرتے نہر کے کنارے پہونچا۔ تو کیا دیکھتا ہوں !
 چند خوبصورت ماہروں جو ان آسٹے۔ اور اُس نہر میں پانی پینے اور غوطہ
 لگانے لگے۔ جب وہ نہادھو کر اُس سے نکلے۔ تو اُن کے چہرے بدلے
 ہوئے نظر آئے۔ نہ وہ شکل و شمائل تھی۔ نہ وہ نزاکت و نرمی اور ہر ایک
 کے ذوق و سینگ نکل آئے تھے۔ وہ نہر سے نکلتے ہی ایک دوسرے پر
 حملہ کرنے اور سینگ سے سینگ لڑانے لگے۔ یہاں تک لڑے کہ کسی کا
 سینگ ٹوٹا کسی کا چہرہ بگڑا۔ کسی کا غصہ سے چہرہ لال ہوا کسی کا کف منہ
 سے اڑ کر مجھ تک پہونچا۔ کسی کی گردن کی رگیں مارے غصہ کے تن گئیں
 کسی کے منہ سے آواز غضب کے سبب سے نہ نکلی اسی طرح وہ وحشیانہ
 لڑائی لڑتے ہوئے ایک عالیشان مکان کی طرف چلے میں بھی ساتھ
 ساتھ ہو لیا۔ کہ دیکھوں۔ کیا ہوتا ہے؟ وہاں کیا دیکھتا ہوں ! کہ ایک
 نصف وحشی نصف انسان جس کا چہرہ آدمی کا۔ دم طاؤس کی منہ چڑیا
 کا۔ پیٹ بیل کا۔ چال لومڑی کی ایک رگین سمور کی کھال اوڑھے
 ہوئے کبوتر کی طرح غمخو کر رہا ہے۔ جب وہ سب نوجوان اُس کے
 پاس پہونچے تو اُس کے آگے گر پڑے۔ اُس نے ایک کرہیہ ہولناک
 آواز سے اُن کو پکارا۔ اور آپس کے جھگڑے کا حال پوچھا۔ اُن لوگوں
 نے کچھ ایسی بولی میں اُسے جواب دیا کہ میں نہ سمجھا۔ مگر یہ دیکھا کہ اس
 وحشی آدمی نے کچھ خوش ہو کر کسی کا منہ چوما۔ کسی کو پیار کیا۔ اور
 کسی کو "مرحبا" کہا۔

میں اس معاملہ کو دیکھ کر حیران ہوا۔ اور سپاہ مانگتا باہر نکلا اور اپنے رہنما سے اس اسرار کی خبر پوچھی۔ اُس نے کہا کہ اس نہر کے پانی کی ایسی ہی تاثیر ہے۔ کہ سب ایسی شکل کے ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ وہ نصف وحشی نصف انسان تم نے دیکھا ہے۔ یہ نوجوان۔ نازک۔ ماہر و لڑکے بھی جب زیادہ پانی پیئیں گے۔ خوب غوطے نہریں لگائیں گے تو ایسے ہی ہو جائیں گے اور جو کچھ لڑائی تم نے دیکھی۔ یہ لڑائی نہ تھی۔ بلکہ اُن کا علمی مباحثہ تھا۔ جسکے لفظ بھی تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔“

جب میں نے اس تاثیر کا سبب پوچھا۔ تو رہنما مجھے چشمہ کے کنارے پر لے گیا۔ وہاں کیا دیکھتا ہوں! کہ چشمے کے دہانہ پر دو چشمے اُکڑے ہیں ایک تو سیدھا چلا گیا ہے۔ جو کہ نہایت صاف۔ پاک اور خوش گو اور ہے۔ دوسرا خم و پیچ سے گیا ہے جس میں جا بجا نالے ندیاں ملتی گئی ہیں جو کہ سب کثیف میلی اور ناپاک ہیں۔ مگر پہلے چشمے کے دہانہ پر ایک پتھر کی چٹان آگئی ہے جس سے صاف پانی نہیں آسکتا۔ مگر دوسرا چشمہ کھلا ہوا ہے۔ اُسی کا میلہ بد بودار زہریلا پانی گرتا ہے۔ اور وہی بلغم میں جاتا ہے۔ جس کی تاثیر سے آدمی مسخ ہو جاتے ہیں۔

جب میں نے اُن چشموں کا حال پوچھا تو خرد نے تحقیق نامے رفیق کو میرے ساتھ کر دیا۔ اس کے ساتھ میں اُن دونوں چشموں کی حقیقت دریافت کرنے کو چلا۔ مدت بعد سب حال دریافت کر کے اس فکر میں پڑا کہ اُس پتھر کی چٹان کا حال کسی سے پوچھوں۔ تب تارہ مخ

نلے ایک روشنی ضمیر ملا۔ اُس نے کہا۔ کہ ہزار برس ہوتے ہیں۔ تب میں اس باغ میں آیا تھا۔ نہایت تروتازہ۔ سبز و شاداب تھا۔ جیسا وہ باغ جو ہم نے اول دیکھا ہے۔ اس باغ کی نہروں میں صاف چشمہ کا پانی آتا تھا اور گدلے چشمہ پر پتھر رکھا ہوا تھا۔ مگر سرکتے سرکتے اب وہ صاف چشمہ پر آ گیا ہے۔

تب تو میں نے خیال کیا۔ اس پتھر کو ہٹا دوں۔ چنانچہ میں تہمت کو ہاتھ لے کر چلا۔ مگر چند خوشخوار وحشی درندوں نے مجھ پر حملہ کیا۔ اور پتھر سرکانے پر مجھے موت کا خوف دلایا۔ میں جان بچا کر ہٹا میرے رہنا نے کہا۔ کہ اور بھی تیری طرح اس ارادہ پر آئے۔ مگر ان کے خوف سے بھاگ گئے۔ میں تجھے ایک مشعل دیتا ہوں جس کی روشنی سے یہ اندھے ہو کر بھاگ جائیں گے۔ چنانچہ بصیرت کی مشعل اُس نے مجھے دی۔ حقیقت جب میں وہاں مشعل لے کر پہنچا۔ تو کوئی میرے پاس نہ آیا۔ آخر میں بفرغت پتھر سرکانے لگا۔ پر وہ ایک مجھ سے کب سرکتا تھا! میں تھک کر بیٹھ رہا۔ کہ ہمدردی نلے واعظ میرے سامنے آیا اور کہا۔ کہ ”مجھے اجازت دو۔ تو کچھ مدد کرنے والے آؤں“ میں نے خوش ہو کر اُس کا شکریہ کیا اور بڑے زور شور سے اُسے اپنی ہی صورت شکل والوں پاس بھیجا۔ پراسفوس! کہ بہت کم لوگوں نے اُس کی بات سنی جو لوگ اُس نہر کا پانی پی چکے تھے۔ وہ تو مارنے کو دوڑے۔ اور جو لوگ ابھی اُس سے نیچے ہوئے تھے اُن کے کان بہرے تھے۔ انھوں نے کچھ نہ سنی۔ آخر وہ باحسرت

ویاس واپس آیا۔ اُس کے لوٹنے کے بعد میں نے چاہا۔ کہ اس خیال کو چھوڑ دوں۔ اور یہ پیچہ جیسا رکھا ہے ویسا ہی رہنے دوں پر استقلال ملے ایک رجز خوان نے میرا دل بڑھایا۔ اور مجھے ایک تدبیر بتائی اُس نے کہا میں نے ایمان نامے فقیر سے سنا ہے۔ کہ اس چشمہ کا ایک بکھودنے والا ہے۔ وہ سب مشکل حل کر سکتا ہے۔ مگر بڑی مشکل سے انسان کی رسائی اس تک ہو سکتی ہے۔ اُس کی راہ میں اقل تو مصیبت کا ایک بڑا میدانِ ق و دق ملتا ہے۔ جہاں سوائے آنکھ کے پانی کے پینے کو بھی کچھ نہیں۔ اگر اُس سے بچ گئے تو رسوائی و بدنامی کے سات سمندر ملتے ہیں۔ جہاں صبر کی ٹوٹی پھوٹی کشتی کے سوا عجب کاکوئی ذریعہ نہیں۔ تب دروازہ اُس کا ملتا ہے۔ جہاں اخلاص کی نذر کش کرنی پڑتی ہے۔ اور دعا کے پاک صاف ہاتھوں کے ذریعہ سے پہونچائی جاتی ہے۔ تب وہ نذر قبول ہوتی ہے اور اجابت کا خلعت ملتا ہے۔ گو کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ برسوں نذر کی قبولیت کی نوبت نہیں آتی پس اگر تم کو اس پیچہ کے سر کاٹنے کی خواہش ہے۔ تو وہاں تک جاؤ۔ اگر اُس تک تمھاری رسائی ہوئی۔ اور اُس نے تمھاری نذر لے لی تو وہ قابلِ اکو تمھارے ساتھ کرے گا۔ جب تم اس کو لوگوں کے سامنے لاؤ گے سب کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ جواب بند ہو رہی ہیں تب وہ اپنے سوکے ہوئے باغ کو دیکھ کر تعجب کر نیگے اور تمھارے ساتھ پیچہ سر کاٹنے پر مستعد ہوں گے۔ آخر چند ہی روز میں گدے چشمہ کا پانی بند کر کے صاف

پشتمہ۔ گے پانی سے اپنی نہریں بھر لیں گے اور اپنے باغ کو پہلے سے بھی زیادہ سرسبز اور شاداب کریں گے۔ تب یہ سوکھا ہوا باغ اُس ہرے باغ سے بھی تمھاری نظروں میں زیادہ سرسبز اور خوشنما معلوم ہو گا۔ کیونکہ نہ وہ بلغ تمھارا باغ ہے۔ نہ وہاں کوئی تم سا ہے اور یہ باغ تمھارا ہی ہے اور سب تم سے ہیں۔ میں نے اُس رفیق کا شکریہ کیا اور اُس کے کہنے کے مطابق چلا کہ دیکھو اب کیا ہوتا ہے؟

جب میں عالم مثال سے لوٹا اور لوگوں سے یہ قصہ کیا۔ تو وہ سب ایک ایک لفظ کی حقیقت مجھ سے پوچھنے لگے میں صرف یہ کہہ کر کہ جو باغ ہر ابھرا میں نے مغرب میں دیکھا۔ وہ علوم و فنون جدید کا باغ ہے جس کے پھل پھول ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ پر ہمارا دل ہلانے والا وہاں کوئی نہیں ہے اور جو باغ خشک میں نے مشرق میں دیکھا۔ وہ ہمارے ہی علوم قدیمہ کا باغ ہے۔ جس کی دیرانی اور خزاں کی کیفیت ہمارے سامنے ہے۔ وہ پتھر جو حشرِ شیم پر آگیا ہے۔ جہالت ہے۔ وہ تدری ملے گندے پانی کے رسم و رواج کی پابندی نیکی کا تعصب۔ علم نامدوانی جھوٹا زہر جھوٹی شہی۔ جاہلانہ تقریر۔ عامیانہ غلامی۔ ضرر انگیز حرارت و حسیانہ تعینم و ترسیت ہے جس کا نتیجہ مسخ انسانیت ہے۔ جو کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور جس کا علاج اب ہم سوائے دعا کے کچھ نہیں پاتے چپ ہو رہا +

خواجہ الطاف حسین حالی

زبان گویا

اے میری ٹیبل ہزار داستان! اے میری طوطی شید و بیان!

اے میری قاصد! اے میری ترجمان! اے میری دکیل! اے میری زبان! سچ بتا۔ تو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزہ ہے کبھی تو ایک ساحر فنوں ساز ہے جس کے سحر کا رُخ نہ جادو کا اتار۔ کبھی تو ایک غنی جاں گداز ہے جس کے زہر کی دार و نہ کاٹے کا منتر۔ تو وہی زبان ہے کہ

بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بُولوں سے غیروں کا جی بُھائی تھی۔
 شوخیوں سے ماں باپ کا دل ڈکھاتی تھی۔ تو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کہیں تیری
 نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کہیں اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔
 اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دیکھنا تیرا

ایک کھیل ہے جسکے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں +
 اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی! اور میرے بگڑے کاموں کی
 سنوارنے والی! روئے کو ہنسانا اور ہنسنے کو رُلانا۔ روٹھے کو منانا اور
 بگڑے کو بنانا نہیں معلوم تو نے کہاں سیکھا؟ اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں
 جس کی گانٹھیں ہیں۔ اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد
 ہے اور کہیں قاتل۔ کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق +

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں۔ ہمارے ہزاروں نقصان اور ہزاروں فائدے۔ ہماری عزت۔ ہماری ذلت۔ ہماری نیکنامی۔ ہماری بدنامی۔ ہمارا جھوٹ۔ ہمارا سچ۔ تیری ایک ہاں اور ایک نہیں پر موقوف ہے۔ تیری اس "ہاں" اور "نہیں" نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کا سر کٹوایا۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارہ گوشت کے سوا نہیں۔ مگر طاقت تیری نمونہ قدرت الہی ہے۔ دیکھ۔ اس طاقت کو رائیگاں نہ کھو۔ اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ رہتی تیرا جو ہر ہے۔ اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جو ہر کو برباد نہ کر۔ اور اس زیور کو رنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی اچھی۔ دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر۔ اور روح کے پیغام پر حاشیہ نہ چڑھا۔

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ ہمیں تیرا خطاب کا شرف اسرار ہے۔ اور ہمیں تیرا لقب محرم راز۔ علم ایک خزانہ غیبی ہے۔ اور دل اس کا خزانچی۔ حوصلہ اس کا قفل ہے۔ اور تو اس کی کھلی دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول۔ اور اس خزانے کو بے موقع نہ اٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے۔ اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصع مشفق تیری صفت ہے۔ اور مرشد برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا۔ اور اس فرض سے جی نہ چرانا۔ ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھین جائیگا اور تیری بباط میں وہی ایک گوشت کا چھپڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو

یہ اُمید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے۔ اور طوفان بھی اٹھائے۔ تو غیبت بھی کرے۔ اور تهمت بھی لگائے۔ تو فریب بھی دے۔ اور چلیاں بھی کھائے اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے نہیں! ہرگز نہیں! اگر تو سچی زبان ہے۔ تو زبان ہے۔ ورنہ زبوں ہے۔ بلکہ سراسر زبان ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے۔ تو شہد فائق ہے۔ ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو درست گفتار ہے۔ تو ہمارے منہ میں اور دوسرے کے دلوں میں جگہ پائیگی ورنہ گدھی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان چمنوں نے تیرا کہنا مانا۔ اور جو تیرا حکم بجالائے۔ انھوں نے سخت الزام اٹھائے اور بہت پچھلے کسی نے انھیں۔ فریبی اور مکار کہا کسی نے گستاخ اور منہ پھٹا ہکا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بد عہد بنایا۔ اور کسی نے غماز۔ غیبت اور بہتان لکرا اور افترا۔ طعن اور تشنیع گالی اور دشنام۔ پھکڑ اور ضلع جگت اور بھینتی۔ غرض دنیا بھر کے عیب اُن میں نکلے۔ اور وہ سب کے سزاوار ٹھہرے۔ اے زبان یاد رکھ۔ ہم تیرا کہنا مانینگے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئینگے ہم تیری دُور دُوبیلی نہ چھوڑینگے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائینگے۔ ہم جان پر کھیلیں گے۔ پر تجھ سے جھوٹ نہ بلوائینگے۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائینگے۔ اے زبان! ہم دیکھتے ہیں۔ کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے۔ تو بے اختیار ہنسناتا ہے۔ اور گستاخِ پیار کے مارے بیتاب ہو جاتا ہے تو اپنے مالک کے سامنے دُوم ہلاتا ہے۔ سبحان اللہ!

وہ نام کے جانور۔ اور اُن کا ظاہر و باطن یکساں۔ ہم نام کے آدمی اور جانور
دل میں نہیں اور زبان پر ہاں“ ✽

آہی، اگر ہم کو مخصیبت گفتار ہے۔ تو زبان پرست گفتار دے۔ اور
اگر دل پر کجی کو اختیار ہے۔ تو زبان پر ہم کو اختیار دے۔ جب تک دنیا
میں رہیں سچے کہلائیں۔ اور جب تیرے دربار میں آئیں۔ تو سچے بنکر آئیں ✽
(حالی)

حیاتِ سعدی

شیخ کا نام۔ نسب۔ ولادت اور بچپن

اُس کا نام شرف الدین اور مُصلح لقب اور سعدی تخلص ہے۔
سرگور او سلی نے اُسکی ولادت ۸۵۰ھ ہجری مطابق ۱۴۳۳ء میں لکھی ہے
مگر وہ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے اتابک مظفر الدین ٹکلی بن زنگی
کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کی ولادت کے کئی برس
بعد اتابک سعد زنگی اپنے بھائی ٹکلی بن زنگی کی جگہ تخت شیراز
پر متمکن ہوا تھا۔ چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا
شروع کیا تھا اور نیز شیخ کا باپ عبداللہ شیرازی سعد کے
ہاں کسی خدمت پر مامور تھا۔ اس لئے اس نے اپنا تخلص سعدی
قرار دیا۔ شیخ کا باپ جیسا کہ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ ایک
با خدا اور متورع آدمی تھا۔ شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم

نہیں۔ کہ ناز و زہ کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کر لئے گئے تھے اور بچپن ہی میں اُس کو عبادت۔ شب بیداری اور تلاوت قرآن مجید کا کمال شوق تھا۔ عید اور تہواروں میں ہمیشہ باپ کے ہمراہ رہتا تھا اور کہیں آوارہ پھرنے نہ پاتا تھا۔ باپ اُس کے افعال و اقوال کی مگرانی عام باپوں کی نسبت زیادہ کرتا اور بے موقع بولنے پر زجر و توبیخ کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اسی باپ کی تادیب اور زجر و توبیخ کو قرار دیا۔

شیخ کی تعلیم کا حال

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زہد و عبادت اور صلاح و تقویٰ کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی۔ اس کے سوا شیخ ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ مگر اُس نے ہوش سنبھالتے ہی شیراز اور اُس کے قرب و جوار میں علما اور مشائخ اور فصحا اور بلغا کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی اور اُن سے بھی زیادہ ایک جم غفیر کا شہرہ جو خطبہ فارس میں اہل کمال ہو گزرے تھے۔ بزرگوں سے سنا تھا۔ قاعدہ ہے کہ بزرگوں اور کاملوں کے دیکھنے۔ یا اُن کی شہرت اور ذکر خیر سننے سے ہونا رنڑیوں کے دل میں خود بخود دان کی آہیں اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے اسی لیے تحصیل علم کا شوق اُس کو دامگیر ہوا۔ اگرچہ دارالعلم شیراز میں تحصیل علم کا

سامان مہیا تھا۔ علمائے حلیل القدر درس و تدریس میں مشغول تھے۔ مدرسہ
 عضدیہ جو کہ عضد الدولہ دہلی نے قائم کیا تھا۔ اور اس کے سوا اور
 مدرسے وہاں موجود تھے۔ لیکن اُس وقت وہاں ایسی اتبری اور
 خرابی پھیلی ہوئی تھی۔ کہ اہل شیراز کو ایک دم اطمینان نصیب
 نہ تھا۔ اگرچہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل۔ رحم دل با مروت
 اور فیاض بادشاہ تھا۔ مگر اس کی طبیعت میں۔ اولوالعزمی حد سے
 زیادہ تھی۔ اکثر شیراز کو خالی چھوڑ کر عراق کے حدود میں لشکر کشی کرتا رہتا
 تھا۔ اور اپنی مہمات کے شوق میں ممالک محروسہ کو بالکل فراموش
 کر دیتا تھا۔ اُس کی غیبت کے زمانہ میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی
 پا کر اطراف و جوانب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے اور قتل و غارت
 کر کے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ ساڑھے صدی کے آغاز میں اول
 اتابک اوزبک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان غیاث الدین
 نے بہت سے لشکر کے ساتھ آکر شیراز کو ایسا تاخت و تاراج کیا۔ کہ
 اُس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا۔ ایسی حالت میں
 تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار بلکہ ناممکن تھی اس کے
 علاوہ امن کے زمانہ میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیل
 علم میں رخنہ انداز ہوتے ہیں۔ یہ اسباب تھے جنہوں نے شیخ کو ترک
 وطن پر مجبور کیا۔ چنانچہ ذیل کے اشعار میں اُس نے شیراز سے
 تنگ آکر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے۔

دلہا صحبت شیراز بہ کلی بگرفت وقت آنست کہ پُرسی خبر از بغدادم
 سعدیا حُبِ وطن گرچہ حدیثِ سرِ صبح نتوان مُرد بسختی کہ من اینجا زادم
 قمرِ جمہ میرادل شیراز کی صحبت سے تنگ آگیا۔ اب وہ وقت ہے
 کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو۔ اے سعدی وطن کی محبت اگرچہ صحیح
 بات ہے۔ مگر اس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں۔ سختی میں
 مرا نہیں جاتا ۛ

شیخ کے عام حالات

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی اور جفاکش آدمی تھا اُس کے قوی
 کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے دس بارہ حج پیادہ پا کیے
 تھے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صحراؤں اور دیہ پیمائی میں بسر کیا
 اور ایک سو بیس برس کے قریب عمر پائی ۛ
 اُس نے حیرت پیادہ پا ہی سفر نہیں کیے۔ بلکہ بعض اوقات تنگ
 پاؤں چلنے کا بھی اتفاق ہوتا تھا جس طرح اکثر اہل سلوک نفس شکنی کے
 لیے اپنے مشائخ کے اشارہ سے سالہا سال ادنیٰ درجہ کا کام اور محنتیں
 کیا کرتے ہیں۔ اُس نے بھی بیت المقدس اور اُس کے گرد و نواح میں
 ایک مدت تک سقائی کی تھی ۛ

اُس کو تذکرہ نویسوں نے اہل باطن اور صوفیہ میں سے شمار کیا ہے
 اُس کے کلام سے بھی جا بجا یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس رنگ میں
 ڈوبا ہوا تھا۔ بے شک وہ صوفی بھی تھا اور واعظ بھی۔ مگر آج کل

کے مشائخ اور وعظین کے برخلاف۔ ایک نہایت بے تکلف گھلاؤلا
 یار باش۔ ہنسوڑ۔ ظریف۔ ریا اور نمائش سے دور۔ سیدھا سادہ مسلمان
 تھا۔ اُس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے تئیں لوازم بشریت
 سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور بے تکلف مقدس فرشتوں کی صورت میں جلوہ
 ہونا ہرگز نہ آتا تھا۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ مگر مشرق
 کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا اُس نے مثل ظہیر
 رشید۔ خاقانی اور آوری وغیرہم کے بادشاہوں کی مداحی اور
 امیروں کی بھٹی کرنے کو اپنی وجہ معاش نہیں بنایا تھا۔ با اینہما
 وہ امرا اور سلاطین سے ملتا بھی تھا اور ان کی مدح میں قصیدے
 بھی لکھتا تھا اور جو کوئی عقیدت یا محبت سے اُس کی کچھ نذر کرتا تھا۔
 وہ لے بھی لیتا تھا۔ اُس کے عام مدحہ قصائد دیکھنے سے معلوم ہو سکتا
 ہے کہ وہ یہ قصیدے کس غرض سے لکھتا تھا۔ زیادہ تر اُس کے
 قصیدے ایسے ہیں۔ جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی اصول کے موافق
 بہت مشکل سے قصیدہ کہا جاسکتا ہے۔ امیروں سے وہ اس لئے بھی
 زیادہ تر میل جول رکھتا تھا۔ کہ اکثر اُس کی سفارش سے (جیسا کہ گلستاں
 کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا ہے) غریب آدمیوں کے کام کھانے تھے۔
 خود داری اور غیرت اُس میں ایسی تھی۔ کہ نہایت ضرورت اور احتیاج
 کے وقت بھی وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ جیسا کہ اسکندر یہ کے قوط
 میں اُس سے ظہور میں آیا۔ خلقت کی خیر خواہی اور ہمدردی خدا تعالیٰ

نے اُس کی سرشت میں ودیعت کی تھی۔ اُس کے نصائح اور مواظبات ہرگز اس قدر مقبول نہ ہوتے۔ اگر انسانی ہمدردی کا جوش اُس کے دل میں نہ ہوتا۔ اُس نے اپنی زبان اور قلم کو پند و نصیحت کے لئے وقت کر دیا تھا۔ اور حق بات کہنے سے خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتا تھا۔ کوئی شخص کسی چیز میں کامل نہیں ہو سکتا۔ جب تک دو باتیں جمع نہوں ایک جو ہر فطرتی دوسرے زمانہ کے ایسے اتفاقات جو اُس کی جلا کے باعث ہوں۔ شیخ کی ذات میں جس قسم کی قابلیت تھی اُسی کے موافق اُس کو اتفاقات پیش آئے تھے۔ جس شہر میں وہ پیدا ہوا تھا وہ خود ایک مہر دم خیریت تھا۔ ہاں ہونہار بچوں کو خود بخود کسب کمال کی ترغیب ہونی چاہیے۔ بیٹی اور بے پردہ سی اگرچہ اکثر صورتوں میں آوارگی اور بتری کا سبب ہوتی ہے لیکن بسا اوقات ایسی مجبوری اور بے کسی کی حالتیں غیرت مند اور جفاکش لڑکوں کے حق میں ترقی اور رشد کا باعث ہوتی ہیں۔

جس مدرسہ میں وہ حسن اتفاق سے تحصیل علم کے لئے پہنچا۔ وہ تمام مدارس اسلامیہ میں ممتاز اور سربراہ اور وہ دارالافتاء میں وہ مدرسہ واقع تھا۔ وہاں کی سوسائٹی اُس وقت تقریباً تمام دُنیا کی سوسائٹیوں کی نسبت زیادہ شائستہ اور مہذب تھی۔ اُس نے صرف درس و کتاب ہی سے استفادہ حاصل نہیں کیا تھا۔ بلکہ زمانہ نے بھی اُس

کی تادیب خاطر خواہ کی تھی اُس کی عمر کا ایک بہت بڑا اور مفید حصہ نہایت کٹھن اور دُور دراز سفر کرنے اور دُنیا کے عجائبات اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں بسر ہوا تھا۔ سلطنتوں کے پے در پے انقلابات اور ملکوں کے متواتر تغیرات۔ ظالم بادشاہوں اور بے رحم حاکموں کے ظلم و ستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دلسوزی اور ہمدردی اُس کی طبیعت میں راسخ ہو گئی تھی۔ بیسیوں خاندان اُس کی آنکھوں کے سامنے بنے اور بیسیوں بگڑ گئے۔ ایک بار جیسا کہ گلستاں میں مذکور ہے شام میں اُس کے روبرو ایسا انقلاب ہوا کہ وزیروں کی اولاد بھی یک مانگنے لگی اور روتائی زامے وزارت کے درجے کو پہنچ گئے۔

ساتویں صدی میں جس میں کامل عقل و ہوش کے ساتھ اُس نے کیا نوے برس بسر کیے تھے۔ عجیب و غریب تماشے اُس کی نظر سے گزر گئے۔ سلاطینِ کُردیہ کا خاندان جن کی سطوت و جلالت۔ ایشیا۔ افریقہ و یورپ میں کیاں مانی جاتی تھی۔ اسی صدی میں تمام ہوا۔ سلاجقہ قونیہ اور خوارزم شاہیوں کی نہایت سخت لڑائی جس نے دونوں سلسلوں کو تحلیل کر دیا۔ اسی صدی میں ہوئی۔ پھر خوارزمیوں کی سلطنت جو بحیرہ خزر اور جمیل یورال سے دریاے ہندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسی صدی میں تاتاریوں کے ہاتھ سے برباد ہوئی۔ بنی عباس کی خلافت سوا پانچو برس بعد اسی صدی میں ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہوئی۔ اور بقول بعض مورخین کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون

مغلوں کی تلوار سے دجلہ کی ریتی میں بہ گیا۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا ذکر گلستاں اور بوستاں میں ہے۔ اور مصر کا قحط جس میں حسب تصریح صاحب و صفات ایک ایک روٹی ہزار ہزار دنیا کو یک لگئی۔ اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی بھوکا مر گیا۔ اسی صدی میں واقع ہوئے۔ اتابکان فارس کے خاندان پر اسی صدی میں زوال آیا۔ دارالملک شیراز جو شیخ کا مولد و مسکن تھا۔ اسی صدی میں کئی بار قتل اور غارت کیا گیا۔ فرقہ اسماعیلیہ جو پوپ نے دوسو برس مشرق میں نہایت زور شور کے ساتھ حکمراں رہا۔ ان کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں اور کردوں نے شام میں ہمیشہ کے لئے اسی صدی میں کیا۔ یہ تمام حوادث اور وقائع شیخ کے سامنے ظہور میں آئے تھے۔ جن سے ایک صاحب بصیرت آدمی بے انتہا عبرت اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ چنانچہ بغداد کا مرثیہ جو اُس نے عربی میں لکھا ہے۔ اُس میں کہتا ہے "خدا حمایت کرے اُس شخص کی۔ جو خلافت عباسیہ کے زوال کے بعد متنبہ ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبت عمرو کے لئے تازیانہ ہے" یورپ کے مشہور مصنف ہاک بلر صاحب کا قول ہے۔ کہ میں نے عہدہ تعلیم صرف ایک اسکول یعنی مدرسہ روزگار میں پائی ہے جس میں محنت اور مصیبت دو بڑے گرم جوش اور دلسوز استاد تھے۔

ڈاکٹر مولوی تہذیب احمد صاحب شمس العلماء ایل ایل ڈی (اڈیسرا)

(اثر دیوایاے صادقہ)

ریاضت جسمانی

ایک تو ہمارے یہاں کے کھیل ہیں جن میں سے اکثر بے سود اور بے فائدہ ہوں تو خیر! اُس لئے مضمون بہ اخلاقی کنی تہذیب کاہلی کی تعلیم اور بعض میں جو کچھ دماغی فائزے نکل سکتے ہیں۔ مثلاً گنچھ میں حافظے کی ترقی پھر شطرنج میں غور اور غوض کی عادت۔ تو ان میں بڑی قباحت یہ ہے کہ دنیاوی معاملات میں ان سے نطق نہ نہیں ملتی۔ اگر کوئی شخص گنچھ اچھا کھیلتا ہے تو اس کے یہ معنی ہر کہ اس کو پتوں کی یادداشت اچھی ہے۔ لیکن بازیوں کے ورق یاد رکھنے سے کتابوں کے ورق تو کیا! مضمون بلکہ دو چار سطروں بھی یاد نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح بڑے سے بڑا شاطر شطرنج کے نقشے میں خوب طبیعت لڑاتا ہے۔ مگر ایک سیدھا سا مقدمہ اُس کے سامنے بیان کرو۔ تو سمجھ نہیں سکتا۔ تہذیب سوچے گا کیا اپنا سر۔ غرض ہندوستانیوں کے جتنے کھیل ہیں سب نکلے۔ موجب تفتیح وقت۔ اب مدرسہ کے کھیلوں پر نظر کرو۔ تو بڑی جسمانی ریاضت۔ اور تفریح طبع کے علاوہ دماغی زحمت کا کچھ دخل نہیں۔ کیونکہ اوقات درس میں جتنی دیر پڑھنے میں مصروف رہے جس دماغی محنت بہتیری ہوئی اب کھیل میں بھی شطرنج کی طرح سوچنا

چھے۔ تو دماغ کہاں تک اس فشار کو دفا کر سکتا ہے۔ اور اگر جسم سے بالکل کام نہ لیا جائے۔ تو جس طرح گھوڑا تھکان پر بند ہے۔ بند ہے ہڈے کے موڑے کمال لاتا۔ آدمی میں بھر جاتا۔ دانہ گھاس اچھی طرح ہضم نہیں کر سکتا۔ تھوڑی دُور چلنے سے ہانپنے لگتا۔ گوس دو گوس دوڑانا چاہو۔ تو دو نہیں سکتا۔ یہی حال آدمی کا ہے۔ کہ اگر وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے کام نہیں لیتا۔ تو اگر اور کوئی بیماری اُس کو نہ بھی ستائے۔ یہ کیا تھوڑی بیماری ہے کہ وہ اپاہج ہو جاتا ہے۔ اسی آرام طلبی کے نتیجے ہیں۔ کہ ہماری عمروں کے اوسط گھٹتے اور ہماری نسلیں کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں *

خیر کابل کے پٹھانوں اور گوروں کے ساتھ ہم ہندوستانی گز نہیں کیا مقابلے کریں گے۔ اپنے ہی ملک کے دیہاتی بھی شہر میں آن سکتے ہیں۔ تو اُن کو دیکھ کر عقل حیران ہو جاتی ہے۔ کہ اتنی یہ بھی آدمی ہیں! جکی کاٹھیاں ٹوہنے کی اور ہاتھ پاؤں پتھر کے ہیں۔ معلوم ہے کہ ساگ بھوجی اور جوار یا جرے کی روٹی کے سوا اور کچھ میسر نہیں آتا۔ مگر یہ آنکھوں کی بھی بات ہے کہ ایک دیہاتی سو سو اسو من کی چولہی گاڑی ہانٹے لئے چلا جاتا تھا۔ شہر کی بھیڑ دیکھ کر تیل بد کے۔ کہ گاڑی کا ایک پتہ نالی میں جاتا رہا۔ بیلوں نے ہتیرا زور مارا پتہ جگہ سے نہ کھسکا۔ گاڑی بان نے اتر کر کمر کا سہارا لگا بات کی بات میں گاڑی کو ایسا دھکا دیا کہ بیچ سڑک میں۔ نہ دیہاتیوں کا پانی۔ نہ شہریوں کا ماء اللحم۔ نہ اُن کا چبٹا اور نہ ہمارے بادام پستے میٹاک شہر اور دیہات کی آب و ہوا میں بھی بہت

بڑا فرق ہے۔ مگر دیہاتیوں کی توانائی اور ان کا مانتھا پن ہے محنت کی وجہ سے۔ شہر کی ایک تو کثرت آبادی کی وجہ سے آب و ہوا خراب اس پر محنت مشقت ندارد۔ جس کو دیکھو بدن پر بوٹی نہیں۔ اور بوٹی ہو تو کہاں سے ہو۔ بیچارے کو کبھی کھل کر بھوک نہیں لگتی۔ اور مارے ہو کے کے کچھ بے اشتہا کھا لیتا ہے۔ تو ہضم نہیں ہوتا۔ اور جنہم میں پہلوان کلاتے ہیں سینہ ابھرا ہوا ہے قبضے چڑھے ہیں۔ دیکھنے کو موٹے تازے۔ داؤ پیچ بھی خوب رواں۔ مگر اصلی بل بوتان میں بھی نہیں۔

اس پر ایک حکایت یاد آئی ہے کہ جن دنوں قلعہ آباد تھا تو سلاطین کو سوائے اوقات گذاری کے اور کوئی کام نہ تھا تلے بیٹھے بیٹھے ان کو ایسے ہی مشغلے سوجھتے تھے کہ تار بجا رہے ہیں یا بیئر لڑا رہے ہیں یا شطرنج کھیل رہے ہیں۔ یا اس کی دھن ہے۔ کہ کوئی ایسی قسم کا کھانا کھائے کہ کوئی پہچان نہ سکے۔ چنانچہ ایک صاحب عالم کو پہلوانوں کی کشتی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ بہت سے پہلوانوں کے رات ب بندھے تھے اور انھوں نے ایسی ایسی جوڑیں تیار کی تھیں۔ کہ رجاڑوں میں جا جا کر کشتیاں مارتے تھے۔ ایک مصاحب کو یہ سوجھی کہ ان دنوں ولایتی میوہ فروش آئے ہوئے ہیں۔ کسی ولایتی کو ایک پہلوان سے لڑوایا جائے صاحب عالم اس ایجاد کو سنکر پھرک گئے۔ اور فرمایا بھئی واشد تخت کی قسم ہے! کیا بات پیدا کی ہے! معمولی کشتیاں دیکھتے دیکھتے جی اکتا گیا ولایتی کی کشتی میں مرزہ تو خوب آئے گا۔ دیکھیں وہ پیچ کا کیا توڑ کر تلے

داروغہ جی دینا ان کو ایک دو سالہ۔ اور بھائی تم ہی اس کشتی کا اہتمام بھی کرنا۔ اور میں حضور میں بھی عرض کروں گا سرفراز فرمائیں گے۔

نہیں معلوم۔ ظالموں نے کیا تدبیر کی کہ ایک اکھڑ وحشی ولایتی کو کچھ دے کر شاہی پہلوان کے ساتھ لڑنے کو رضی کر لیا۔ ولایتی کو ہم نے بھی دیکھا تھا۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ مارے دہشت کے نظر نہیں ٹھہرتی تھی آدمی کا ہنس کو تھا۔ ایک دیو کا دیو تھا۔ بابوں کی لٹیں کندھوں تک لٹکتی ہوئیں میلے کثیف کپڑے۔ چار چار پانچ گز سے مست دُنبے کی سی بو آتی تھی۔ ایسی سخت۔ کہ ناک نہ دی جائے۔ پیٹھ پر ہینگ کا مشکیزہ۔ ادھر جوتیوں سے۔ اُدھر مشکیزہ سے چپڑ چپڑ کی آواز چلی آئے تو خوار آنکھیں۔ ڈراؤنی صورت۔ لوگ جو اس کو بہلا پھسلا کر لائے تھے اُس کے گرد اگر ایسے معلوم ہوں۔ جیسے بڑے آدمی کے آگے بچے۔ اور یہاں اکھاڑے میں پہلوان پڑے چھوم رہے تھے۔ کوئی ڈنڈ پیل رہا ہے۔ اور کوئی تین سواتین من کی جوڑی کے رومالی ہاتھ اس خوبصورتی اور صفائی سے ہلار رہا ہے۔ کہ سارے تماشائیوں کی ٹانگی اُس پر بندھی ہے کوئی ییزم کی کثرت کر رہا ہے۔ کوئی بنیٹی کے کمر تب دکھا رہا ہے اتنے میں غل ہوا کہ وہ پٹھان آیا۔ جوں اُس کو لاکر اکھاڑے کے پاس کھڑا کیا۔ اُس کا پھیلاؤ دیکھ کر پہلوانوں کا رنگ فق ہوا۔ اب کسی کی ہمت نہیں پڑتی۔ کہ موت کے منہ میں جائے۔ اور ولایتی ہے کہ زمین میں آلتی پالتی مارے ہینگ کے مشکیزہ کا گاؤں کیہ

بنائے نظر حیرت و تعجب سے سب کو ٹھیکہ رہا ہے۔ اور ان پہلو انوں کو سمجھتا ہے کہ تلوں کا تاشا کر رہا ہے۔

اکھاڑے کا استاد اگرچہ تھا تو عمر سے اتر ا ہوا۔ مگر اس کا بدن ایسا مرتب تھا۔ اور اس کو ایسے ایسے داؤ گھات یاد تھے۔ کہ یکایک کوئی اس سے لڑنے کی ہامی نہیں بھرا تھا۔ مگر وہ خوب جانتا تھا۔
 فریبی چیر سے دگر آنا اس نے میر سے دگر میر سے

اس نے چٹپکے سے صاحب عالم کے پاس جا کر عرض کیا کہ آج تک آپ کے اکھاڑے نے کسی سے تلچا نہیں دیکھا۔ اور استاد کی برکت سے ہمارے یہاں کے چٹھے بھی اپنے وقت کے رستم و اسفندیار ہیں لیکن سرکار راجرس کے چاقو کو قصائی کے بچے سے پھراتے ہیں ساری عمر ہم نے سرکار کا نمک کھایا۔ حکم کی تعمیل میں مبالغہ نہیں پکھڑیں گے تو نہیں۔ مگر اس کے پاڑ تو ملاحظہ کیجیے کہ کلائی دونوں ہاتھوں میں سمائی مشکل ہے۔ سرکار کو جان ہی لینی منظور ہے۔ تو بسم اللہ اس کا دبوچا ہوا آدمی پھنکا بھی تو نہیں کھانے کا۔ اونٹ کی پکڑ کو اس کی پکڑ سے کیا نسبت؟ صاحب عالم سمجھے تو سہی۔ مگر سارے میں قل مچا چکے تھے۔ کس طرح کشتی کو ملتوی کر دیتے! ♦

بارے لوگوں نے دلالتی سے کہا کہ آغا! ان لوگوں میں سے جس کے ساتھ تمہارا جی چاہے کشتی لڑو! آغا! ہم سب کے ساتھ لڑے گا! ♦
 اب تو پہلو انوں کے دم میں دم آیا۔ خیر ایک کی دار و دو۔ استاد

اور شاگرد سارے کا سارا کھاڑا اکیلے کو لپٹ پڑا۔ جو جو داؤ بیچ
 یاد تھے سبھی نے تو چلائے۔ آغا ہیں کہ قطب از جا نہ جنبد۔ لوہے
 کی لاٹ کی طرح گرے ہوئے کھڑے ہیں +
 ان لوگوں نے نادانی یہ کی۔ کہ آغا سے گتھ گئے۔ اس نے موقع
 پا کر ایک کو تو اس بغل میں داہا۔ اور دوسرے کو دوسری بغل میں
 اس نے تو اپنے نزدیک آہستہ ہی سے دبا یا تھا۔ مگر ان میں کا ایک تو
 آج تک کوب لیے پھرتا ہے۔ اور دوسرا مدتوں خون تھوکتا رہا۔ اب سنا
 اچھا تو ہو گیا ہے۔ مگر جاڑے کے دنوں میں مارے پیلیوں کے درد کے
 بیچارے سے سانس نہیں لیا جاتا +

خیر بنی آدم میں یہ ولایتی پٹھان تو اور ہی نسل کے ہیں۔ اور ان کی
 سی بات حاصل کرنی تو مشکل بلکہ محال ہے۔ مگر اسکے عقلی دلائل موجود
 ہیں۔ کہ اگر ہم اپنے طرز تمدن میں صفائی کے قاعدوں کی پوری پوری
 رعایت کریں۔ اور جسمانی ریاضت کی عادت ڈالیں۔ تو آئندہ کی
 نسلیں بہت بہتر ہو سکتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم لوگ گرم ملک کے رہنے
 والے ٹھہرے۔ ہم کو خدا نے محنت کے لیے پیدا نہیں کیا اور نہ ہم سے
 محنت کا شغل ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر شاقہ محنت نہ ہو۔ تو جس قدر برداشت
 کیا جاسکتی ہے وہ بھی سودا کی ایک دوا ہے اور پھر ہلدی لگے نہ پشکری +
 (نذیر احمد)

عقل کی نارسائی

(الذابن الوقت)

بلاشبہ مبدا، قیاض نے انسان کو ظاہری باطنی جتنی قوتیں دی ہیں سب میں عقل بڑی زبردست ہے اور وہی مدار تکلیف شرع بھی ہے لیکن پیش بریں نیست۔ کہ عقل بھی ایک قوت ہے۔ اور جس طرح انسان کی دوسری قوتیں محدود اور ناقص ہیں۔ مثلاً آنکھ کہ ایک خاص فاصلے پر دیکھ سکتی ہے۔ اُس سے باہر نہیں۔ بھر بے روشنی کے کام نہیں دیتی۔ اجسام کثیف میں نفوذ نہیں کرتی۔ اگر دیکھنے والا خود متحرک ہو۔ مثلاً فرض کرو۔ کہ کشتی یاریل میں ہو۔ تو وہ اُلٹا ٹھیری ہوئی چیزوں کو متحرک دیکھتا ہے۔ اور اپنے تئیں ٹھیرا ہوا۔ تیز حرکت تشکل معلوم ہوتی ہے جیسے لڑکے لکٹی سے کھیلے ہیں۔ پایے میں تھوڑا سا پانی بھر کر لکڑی کھڑی کریں تو کچلی ہوئی دکھائی دے گی شفات پانی کی تہ کی چیزیں اوپر کو ابھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور اسی طرح اور بہت سی غلطیاں نظر سے ہوتی ہیں۔ جن کی تفصیل علم مناظر میں موجود ہے +

غرض جس طرح مثلاً ہماری قوت باصرہ محدود اور ناقص ہے۔ اسی طرح عقل کی رسائی کی بھی ایک حد ہے وہ بھی نقصان سے بری نہیں۔ اور اس سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں۔ غلطی کے لئے تو اختلاف رائے کی دلیل کافی ہے ہندسہ کے علاوہ جسکے اصول بدہیات پر مبنی ہیں۔ اور اسی وجہ سے اُس میں اختلاف ہو نہیں سکتا۔ ڈاکٹر فلسفی۔ جی۔ ایشر فورمز (ہیات واد)

پائیشتر (مدبران ملک) اہل مذاہب وغیرہ وغیرہ سمجھی کو دیکھتے ہیں کہ ایک دوسرے سے لڑتے مارتے ہیں منطق کے قاعدے منضبط ہوئے منظر کے اصول ٹھیرائے گئے مگر اختلاف نہ کم ہوا اور نہ تاقیامت کم ہو۔ جب ہمت و نیت کا اختلاف ہو۔ تو ضرور ایک برسر غلط ہے +

اگرچہ عقل انسانی کا نقصان اختلاف رائے سے بھی مستند ہو سکتا ہے۔ مگر ہم ذرا اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ دو ڈھائی سو برس کے عرصے میں اہل یورپ کو سیکڑوں باتیں ایسی دریافت ہوئیں کہ کسی کو کیمیا کا حکمی نسخہ مل گیا ہوتا اور وہ اُس کو عام بھی کر دیتا تو اٹنا فائدہ نہ پہنچتا جتنا کہ ان ماڈرن ڈس کوریٹرز یعنی زمانہ حال کی دریافتوں سے ہوا۔ اور جن اقبال مندوں کو خدا نے واقعات اور موجودات نفس الامری میں غور و غوض کرنے کی دھن لگا دی ہے۔ خدا کی کوششوں کو مشکور و کامیاب کرتا ہے۔ بھرنے پایا ان موجودات میں غوطے لگا رہے ہیں اور معلومات جدید کے بے بہا موتی ہیں۔ کہ برابر نکلے چلے آتے ہیں ان ماڈرن ڈس کوریٹرز میں سے (زیادہ نہیں) صرف ایک چیز عام فہم ہے جس سے انگریزوں کے طفیل میں ہم بھی فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ یہ کہ اب ہم پوچھتے ہیں کہ دنیا میں گھر گھر آگ تھی۔ گھر گھر ہنڈیاں کپتی تھیں ہر نفس بھاپ سے بخوبی واقف تھا۔ سیکڑوں ہزاروں برس پہلے شیم (بھاپ) کی طاقت کیوں نہیں معلوم ہوئی۔ اور یہی سوال ہر

اُس کو دی کی بابت ہو سکتا ہے جواب تک ہوئی یا آئندہ کسی وقت میں ہو
 سر اسحق نیوٹن جس کو سب سے پہلے مسئلہ کشش کا الہام ہوا۔ کہتا
 تھا کہ خدا کی بے انتہا قدرت کے سمندر میں بے شمار موتی بھرے پڑے
 ہیں۔ اور میں تو ابھی کنارے پر بیٹھا ہوا بچوں کی طرح سیپیاں اور
 گھونگے جمع کر رہا ہوں۔ یہ مقولہ تھا اُس شخص کا۔ جس نے زمین اور
 آسمان کے قلابے ملا کر نظام بطلیموس کی جگہ اپنا نظام قائم کیا۔ اور آج
 سارا پورپ اُس کے نام پر فخر کرتا ہے۔ جن کو خدا نے عقل دی ہے
 وہ تو یوں اپنی نارسائی کا اعتراف کرتے ہیں۔ اور ایک ہمارے
 زمانے کے انگریزی خوان ہیں کہ سیدھی سی اقلیدس کی نئی شکل پوچھو
 تو بغلیں جھلکتی لگیں۔ اور لن ترانیاں یہ کہ ہچو ما دیگرے نیست
 پس جوں جوں زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے۔ عقل انسانی کا قصور ہے
 کہ کھلتا چلا جاتا ہے۔ اب سے زیادہ نہیں صرف ڈیڑھ سو برس
 پہلے کسی کی عقل میں یہ بات آسکتی تھی۔ کہ مہینوں کی مسافت ہم
 گھنٹوں میں طے کر سکیں گے۔ یا ہزار ہا کوس کا حال چند لمحے میں
 معلوم کر لیا کریں گے۔ یا آگ سے برت جائیں گے یا پٹرے کی کل میں
 کیا س بھر کر اچھے خاصے ڈھلے ڈھلائے تہ کیے ہوئے تھاں نکال لیا
 کریں گے۔ اور ابھی کیا معلوم۔ کہ ہم کیا کیا کر سکیں گے۔ مگر پھر بھی رہیں گے
 آدمی۔ عاجز نا چیز بے حقیقت +

بھلا آدمی کیا عقل پر ناز کرے گا۔ جب کہ اُس کو پاس کے پاس اتنا

تو معلوم ہی نہیں کہ روح کیا چیز ہے۔ اور اُس کو جسم کے ساتھ کس طرح کا تعلق ہے۔ وقت کے اُزلی ابدی ہونے پر خیال کرتے ہیں تو انسان کی ہستی ایسی بے ثبات دکھائی دیتی ہے جیسے دن رات میں ایک طرفۃ العین بلکہ اس سے بھی کم۔ اور اس ہستی پر انسان کے یہ ارادے اور یہ جوصلے کہ گویا زمین اور آسمان میں سامنا نہیں چاہتا * پھر کیسے کیسے لوگ ہو گزرے ہیں۔ کہ اس سرے سے اُس سرے تک ساری زمین کو ہلایا مارا۔ اور مر گئے۔ تو کچھ بھی نہیں۔ ایک تودہ خاک ! آخر وہ کیا چیز تھی ؟ جو ان میں سے نکل گئی۔ حیوانات۔ نباتات۔ لاکھوں قسم کی مخلوقات کا ایک چکر سا بندھا ہوا معلوم ہوتا ہے کہ زمیں سے پیدا ہوتے اور پھر اُسی میں فنا ہو جاتے ہیں۔ کسی کی عقل کام کرتی ہے ؟ کہ یہ کیا ہو رہا ہے ! اور کس غرض سے ہو رہا ہے ! *

(نذیر احمد)

کارخانہ قدرت

(از ابن الوقت)

کسی کتاب میں نظر سے گزرا۔ کہ زمانہ حال کا کوئی فلسفی خردین میں پانی کی ایک بوند کو دیکھ رہا تھا۔ تلو سے زیادہ طرح کے جاندار تو وہ اس ایک بوند میں بمشکل شمار کر سکا۔ آخر تھک کر بیٹھ رہا۔ ایک بوند میں اتنی مخلوقات ہو۔ تو تمام کرۂ آب میں جو تین چوتھائی زمیں کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ کتنی مخلوقات ہو گی ؟ خدا ہی کو خبر ہے۔ پھر زمین کے گرد اگر د

۴۵ میل کے ذل کا ہوائی گڑھ ہے۔ اور اس میں بھی جان داروں کی
(ایسی ہی یا اس سے زیادہ) کثرت ہے +

ہر خد کا رخاۂ قدرت الہی کی عظمت و شان فہم بشر سے خارج ہے
مگر جس طریق پر میں نے اجمالاً بیان کیا۔ اگر کوئی آدمی متواتر اور متصل
مذہبوں تک غور کرتا رہے۔ تو ضرور اس کے دل میں اپنی بے حقیقتی
اور در ماندگی اور بے وقتی کا یقین پیدا ہوگا۔ جس کو میں دین داری
کی بنیاد یا تمہید سمجھتا ہوں + اس کے بعد ذہن کو اس طرف متوجہ
کرنا چاہیئے۔ کہ اتنا بڑا کارخانہ یا اس عظمت کیسی عمر کی اور کیسے
انضباط کے ساتھ چل رہا ہے۔ کہ عقل دنگ ہوتی ہے اجرام
فلکی کے اتنے اتنے بڑے بے شمار گولے۔ کہ خدا کی پناہ اور خود بین
سب چکر میں ہیں خدا جانے کب سے؟ اور کیوں؟ اور کب تک؟
اور نہ آپس میں ٹکراتے ہیں۔ اور نہ بال برابر اپنی رفتار بدلتے ہیں
اب جو آدمیوں کو قاعدہ معلوم ہو گیا ہے۔ تو سیکڑوں ہزاروں برس
پہلے سے پیشین گوئی ہو سکتی ہے۔ کہ فلاں ستارہ فلاں وقت فلاں
مقام پر ہوگا۔ اور وہیں ہوتا ہے۔ حساب میں اگر غلطی نہ ہو۔ تو منٹ
اور سکند کیا! سکند کے ہزار دیں حصے کی قدر بھی آگیا پیچھا نہیں
ہو سکتا۔

یہاں روئے زمین پر ایک بھنگے۔ ایک دانے۔ ایک پھل یا ایک
پیکٹری گھاس کے ایک ڈنٹھل۔ چھوٹی سے چھوٹی اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیز

کو بھی نظر غور سے دیکھو۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر چیز کی کچھ نہ کچھ غرض و
 غایت ہے جس کی تکمیل کا پورا پورا سامان اس چیز میں موجود ہے۔
 مثلاً ریگستانی علاقوں میں اونٹ پیدا کیا گیا ہے۔ تو اس کے پاؤں
 کے تلوے چوڑے اور اسفنج کی طرح پوٹے ہیں۔ کہ ریت میں نہ دھنیں
 اس کی گردن بہت لمبی ہے۔ تاکہ اونچے درختوں کے پتے چر سکے
 اس کو ایک خاص طرح کا خانہ دار معدہ دیا گیا ہے جس میں کئی کئی ہفتوں
 کے لیے کھانا پانی بھر لیتا ہے۔ کیونکہ جیسے ملک میں وہ پیدا کیا گیا
 ہے۔ وہاں کئی کئی دن تک متواتر پانی چارے کا نہ ملنا کچھ
 تعجب نہیں۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوہان کا گودام ہے
 کہ اگر اس کو ایک عرصہ خاص تک کھانا پینا کچھ بھی نہ ملے۔ تو کوہان
 کی چربی بدل مایہ محل کا کام دے۔ بہرہ وغیرہ جنگلی جانوروں
 کی ٹانگیں تلی تلی ہیں۔ تاکہ شکاری جانوروں سے بچنے کے لیے
 پھرتی کے ساتھ بھاگ سکیں۔ بائسکی کے ایک سوئڈ لٹک رہی ہے
 جس سے وہ ہاتھ کا کام لیتا ہے۔ پرندوں کے جھٹے سبک ہیں۔ تاکہ
 ہوا میں اڑ سکیں۔ دریائی جانوروں کے پنجے کھال سے جڑے ہوئے
 ہیں۔ گویا کہ ہر ایک کے پاس قدرتی چتو ہیں۔ گوشت خوار جانوروں کے
 پنجے اور دانت ان کی غذا کے مناسب ہیں۔ نباتات میں پھل پھول
 کی حفاظت کے واسطے کانٹے ہیں۔ پوست ہیں۔ خول ہیں۔ سرد
 ملک کے جانوروں کی اون بڑی بڑی اور گھنی ہے۔ کہ جاڑا

نہ کھائیں، جتنے جاندار معرضِ تلف میں ہیں۔ اُن میں تو اللہ و تواسل کی
 کثرت ہے تاکہ نسل معدوم نہ ہو۔ مثلاً ایک ایک مچھلی لاکھ سے
 زیادہ انڈے دیتی ہے، آدمی چونکہ ابقائے حیات کا سامان عقل
 کی مدد سے بہم پہنچا سکتا ہے۔ سینک اور پنچے اور اُون۔ اس قسم کے
 سامانِ قدرتی اُس کو نہیں دیے گئے۔ جس ملک میں نباتات کی کثرت
 ہے۔ وہیں برسات بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ملک پانی کا محتاج
 ہے۔ انسان اگر اپنی ہی بناوٹ میں غور کرے۔ تو اُس کا ایک
 ایک رُوں صانعِ قدرت کی کمال دانشمندی اور عنایت پر گواہی
 دے رہا ہے۔ اُس کے جسم میں ایک چھوٹا اور آسان سا پرندہ ہاتھ ہے
 کہ دنیا میں جس قدر انسان کے تصرفات ہیں (اور انسان کی بساط پر
 خیال کرو۔ تو اُن تصرفات کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے) سب اسی
 پرزے کے ہیں۔ اہل یورپ نے عقل کے زور سے بڑی بڑی عثمہ
 کلیں بنائی ہیں اس میں شک نہیں کہ ان کلوں سے عقل انسانی
 کی قوت بڑی شذومہ کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔ مگر مجھ کو بھی دو چار
 کلوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ایک کھیرا ہے۔ کہ بیگہوں زمین
 پر پھیلا ہے۔ سیکڑوں پرزے ہزار ہا بیج۔ بیلن۔ پیسے۔ چرخیاں۔ سکائیاں
 خدا جانے دنیا بھر کے کیا کیا سامان جمع کئے ہیں۔ تب کہیں جا کر وہ
 ایک مطلب حاصل ہوتا ہے۔ جس کے لیے کل بنائی گئی ہے یہ تو
 آدمی کی بنائی ہوئی کلوں کا حال ہے۔ اور ایک ادنیٰ سی کل خدا کی

بنائی ہوئی ہے۔ یہی آدمی کا ہاتھ کہ ہزار ہا قسم کے کام اس سے نکلتے ہیں۔ اور ترکیب دیکھو تو ایسی سلیس اور مختصر کہ ایک کف دست ہے اور تین تین جوڑے کی پانچ انگلیاں۔ اللہ اللہ خیر صلاح !

انسان کے بدن میں ایک اُور ذرے بھر کی چیز آئکھ ہے۔ اُس کی ساخت میں جو اندرونی حکمتیں ہیں۔ اُن سے بالاستیعاب ایک کتاب بن سکتی ہے۔ مگر خارج کی احتیاطوں کو تو دیکھو کہ پہلے گویا پیروں کا کاواک ہے جس میں نگینہ کی طرح آئکھ تعبیه کی ہوئی ہے۔ اوپر بھجوں کا پتھجے دار سائبان۔ سامنے پوٹوں کا پردہ۔ پردے میں پلوں کی جھالر پھر پوٹے کے اندر منافذ ہیں۔ جن میں سے آئینہ چشم کے صاف رکھنے کو ہمیشہ ایک خاص طرح کی رطوبت رستی رہتی ہے۔ یہ وہی رطوبت ہے جو زیادہ ہو کر آنسو بن جاتی ہے۔ جتنی دفعہ انسان پلک جھپکاتا ہے۔ گویا اتنی ہی دفعہ آئینے پر پچارا پھرتا ہے۔ گرد اور دھوئیں اور لٹک کی صورت میں بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں جس کے معنی ہیں کہ پچارا کافی نہیں بلکہ آئینے کو دھونے کی ضرورت ہے۔

میرا تو کیا تمھ ہے۔ کہ موجوداتِ عالم میں جو اُسرا و حکمت مضمّن ہیں اُن کا ایک شتمہ بھی بیان کر سکوں۔ مگر میری غرض اسی قدر ہے۔ کہ دُنیا کے کارخانے کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے۔ کل میں نے آیت اللہ کا سبق سنا۔ وہ عجائب قدرت پڑھتا ہے کسی شخص نے نینچل فلاسفی میں سے بعض بعض مضامین چھانٹ کر اُردو میں ترجمہ کر دیے ہیں۔ انہی میں

لکھا تھا کہ پتھر کے ٹھکے آگے جو ایک پتلی سوڈسی ہوتی ہے وہ حقیقت میں ایک ٹکوا ہے۔ اُس ٹکوبے میں تین اوزار ایک تو سوئی جس کو پتھر سام میں داخل کرتا ہے۔ ایک آرمی۔ کہ سام کو چوڑا کرنے کی ضرورت ہو۔ تو اُس سے کام لے۔ اور ایک سینگی جس کی راہ خون چوٹا ہے اُس میں اتنی بات اڑ بھی تھی۔ کہ اس شکل خاص میں پتھر کی مدت حیات صرف تین دن کی ہے۔ ایک مقام پر تھا کہ تیسری کے ایک پر میں کھپروں کی طرح تیس ہزار دیولیاں!۔ اس طرح کی باتوں کو اگر انسان سرسری طور پر نہ سنے۔ جیسی کہ اُس کی عادت ہے تو ہر ہر ذرہ اس بات کی گواہی دے گا۔ کہ اُس کو کسی بڑے قدرت والے دانش مند۔ ہمہ داں۔ حاضر۔ ناظر۔ سمیع و بصیر نے کسی مصیحت سے جان بوجھ کر بنایا ہے۔ ممکن نہیں۔ کہ انسان صمیم قلب سے موجوداتِ عالم میں غور اور غوض کرے۔ اور اس کا دل اندر سے نہ بولنے لگے۔ کہ یہ اتنا بڑا کارخانہ بایں عمدگی و انضباط خود بخود یا اتفاقیہ طور پر تو نہیں ہو گیا۔ کیونکہ واقعات اتفاقی کی شان ہی دوسری ہوتی ہے۔ اُن میں قاعدہ کا کہاں پتا۔ اور انضباط کا کیا مذکور! اور قاعدہ اور انضباط بھی کیسا؟ کہ دنیا کی ابتدا سے لے کر آج کی گھڑی تک تو اس میں رتی برابر فرق پڑا نہیں +

(نذیر احمد)

شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی

از سفرنامہ

قسطنطنیہ کے مختصر حالات

موجودہ حالت یہ ہے کہ آبنائے باسفورس کی شاخ جو دُور تک چلی گئی ہے۔ یہ شہر اُس کے دو کناروں پر آباد ہے۔ اور اس وجہ سے اس کے دو حصے بن گئے ہیں۔ ایک حصہ استنبول کہلاتا ہے اور تمام بڑی بڑی مسجدیں۔ کتب خانے۔ سلاطین کے مقبرے اسی حصہ میں ہیں۔ مسلمانوں کی آبادی بھی کثرت سے ہیں ہے۔ دوسرا حصہ پیرہ سے شروع ہوتا ہے۔ اور اُس کے انتہائی جانب پر لشکطاس وغیرہ واقع ہیں۔ جہاں سلطان کا ایوان شاہی اور قصر عدالت ہے۔ پیرہ کی دوسری طرف غلطہ ہے۔ اور چونکہ تمام بڑے بڑے یورپین سوداگر اور سُفرائے سلطنت یہیں سکونت رکھتے ہیں۔ اُس کو یورپین آبادی کہنا زیادہ مناسب ہے۔

کہتے ہیں کہ دُنیا کا کوئی شہر قسطنطنیہ کی برابر خوش منظر نہیں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ منظر کے لحاظ سے اُس سے زیادہ خوش نما ہونا خیال میں بھی نہیں تھا۔ اسی لحاظ سے اس کی بندرگاہ کو انگریزی میں گولڈن ہارن یعنی سنہری سینگ کہتے ہیں۔ کہیں کہیں عین دریا کے کنارے پر عمارتوں کا سلسلہ ہے اور دُور تک چلا گیا ہے۔ عمارتوں کے

آگے جو زمین ہے۔ وہ نہایت ہموار اور صاف ہے۔ اسکی سطح سمندر کی سطح کے بالکل برابر ہے۔ اور وہاں عجیب خوش نما منظر پیدا ہو گیا ہے *
شہر کی وسعت تمدن کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ خاص استنبول میں پانچو جامع مسجدیں۔ ایک سو اکتھتر حمام۔ تین سو چونتیس سرائیں ایک سو چونسٹھ مدارس قدیم۔ پانچو مدارس جدید۔ بارہ کالج۔ پینتالیس کتب خانے۔ تین سو پانچ خانقاہیں۔ اڑتالیس چھاپے خانے ہیں کاروبار اور کثرت آمد و رفت کی یہ کیفیت ہے۔ کہ متعدد ڈراموں سے گاڑیاں۔ بارہ دُخانی جہاز زمین کے اندر کی ریل۔ معمولی ریلیں۔ جو ہر آدمی گھنٹے کے بعد چھوٹی ہیں۔ ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ اور باوجود اس کے سڑکوں پر پیادہ پا چلنے والوں کا اس قدر ہجوم رہتا ہے۔ کہ ہر وقت میلہ سا معلوم ہوتا ہے غلطہ اور استنبول کے درمیان میں جو پل ہے۔ اُس پر سے گزرنے کا محصول فی شخص ایک پیسہ ہے۔ اُس کی روزانہ آمدنی پانچ چھ ہزار روپے سے کم نہیں ہے *

قہوہ خانے نہایت کثرت سے ہیں۔ میرے تخمینہ میں چار پانچ ہزار سے کم نہ ہونگے۔ بعض بعض نہایت عظیم الشان ہیں۔ جنکی عمارتیں شاہی محل معلوم ہوتی ہیں۔ قہوہ خانوں میں ہمیشہ ہر قسم کے شربت اور چائے و قہوہ وغیرہ مہیا رہتا ہے۔ اکثر قہوہ خانے دریائے ساحل پر اور بعض عین دریا میں ہیں۔ جنکے لئے لکڑی کا پل بنا ہوا ہے۔ قہوہ خانوں میں روزانہ اخبارات بھی موجود رہتے ہیں۔ لوگ قہوہ پیتے جاتے ہیں

اور اخبارات دیکھتے جاتے ہیں۔ قسطنطنیہ بلکہ ان تمام ممالک میں قہوہ خانے ضروریات زندگی میں محسوب ہیں۔ میرے عرب احباب جب مجھ سے سنتے تھے کہ ہندوستان میں اس کارواج نہیں۔ تو تعجب سے کہتے تھے ”وہاں لوگ جی کیونکر بہلاتے ہیں“ ان ٹلکوں میں دوستوں سے ملنے جلنے اور گرمی صحبت کے موقعے ہی قہوہ خانے ہیں۔

افسوس ہے کہ ہندوستانیوں کو ان باتوں کا ذوق نہیں۔ وہ جانتے ہی نہیں کہ اس قسم کی عام صحبتیں زندگی کی دلچسپی کے لئے کس قدر ضروری ہیں۔ اور طبیعت کی شگفتگی پر ان کا کیا اثر پڑتا ہے۔ دوستانہ مجلسیں ہمارے ہاں بھی موجود ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی دوست کے مکان پر دو چار احباب کبھی کبھی مل بیٹھتے ہیں۔ لیکن اس طریقہ میں دو بڑے نقص ہیں۔ اول تو تفریح کے جلسے پر فضا مقامات میں ہونے چاہئیں۔ کہ تازہ اور لطیف ہوا کی وجہ سے صحت بدنی کو فائدہ پہنچے دوسرے سخت خرابی یہ ہے۔ چونکہ یہ جلسے پراپوٹ جلسے ہوتے ہیں اس لئے ان میں غیبت۔ شکایت اور اس قسم کی لغویات کے سوا اور کوئی تذکرہ نہیں ہوتا۔ بخلاف قہوہ خانوں کے جہاں مجمع عام کی وجہ سے اس قسم کی باتوں کا موقع نہیں مل سکتا۔ قسطنطنیہ اور مصر میں ہمیشہ شام کے وقت دوستوں کے ساتھ قہوہ خانوں میں بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن میں نے کبھی اس قسم کے تذکرے نہیں سنے۔ تفریح اور بذلہ سنجی کے سوا وہاں کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ہو سکتا تھا۔

قطنینہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اگر کسی کو پورے پن اور ایشیائی تمدن کی تصویر ایک مرقع میں دیکھنی ہو تو یہاں دیکھ سکتا ہے کتب فروشوں کی دکانوں کی سیر کرو۔ تو ایک طرف ایک نہایت وسیع دکان ہے۔ سنگ رخام کا فرش ہے۔ شیشہ کی نہایت خوبصورت الماریاں ہیں۔ کتابیں جس قدر ہیں۔ مجلہ۔ اور جلدیں بھی معمولی نہیں۔ بلکہ عموماً مظلّاً و نڈھرب۔ مالک دکان میز کرسی لگائے بیٹھا ہے۔ دو تین کم رن خوش لباس لڑکے ادھر ادھر کام میں لگے ہیں۔ تم نے دکان میں قدم رکھا۔ ایک لڑکے نے کرسی لا کر سنے رکھ دی۔ اور کتابوں کی فرست حالہ کی۔ قیمت فرست میں مذکور ہے۔ اور اُس میں لمبی بیشی کا احتمال نہیں +

دوسری طرف شرک کے کنارے چبوتروں پر کتابوں کا بے قاعدہ ڈھیر لگا ہے۔ زمین کا فرش اور وہ بھی اس قدر مختصر کہ تین چار آدمی سے زیادہ کی گنجائش نہیں۔ قیمت چکانے میں گھنٹوں کا عرصہ درکار ہے +

اسی طرح ہر پیشہ و صنعت کی دکانیں۔ دونوں نمونہ کی موجود ہیں عام صفائی اور زیب و زینت کا بھی یہی حال ہے۔ غلطیہ کو دیکھو۔ تو یورپ کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ دکانیں بلند اور آراستہ۔ سڑکیں وسیع اور ہموار۔ کیچر اور نجاست کا کہیں نام نہیں۔ بخلاف اسکے استقبال میں جہاں زیادہ تر مسلمانوں کی آبادی ہے۔ اکثر سڑکیں نا صاف اور بعض بعض جگہ اس قدر ناہموار کہ چلنا مشکل +

اس شہر میں آکر ایک ستیاج کے دل میں غالباً جو خیال سب سے پہلے آتا ہوگا۔ وہ یہ ہوگا کہ اس عظیم الشان دارالسلطنت کے دو حصوں میں اس قدر اختلاف حالت کیوں ہے؟ چنانچہ میرے دل میں سب سے پہلے یہی خیال آیا میں نے اس کے متعلق کچھ بحث و تفتیش کی۔ باشندوں کے اختلاف حالت کا سبب تو میں نے آسانی سے معلوم کر لیا۔ یعنی مسلمانوں کا افلاس اور دوسری قوموں کا متمول لیکن بٹرکوں اور گزرگاہوں کی ناہمواری و غلاظت کا بظاہر یہ سبب قرار نہیں پاسکتا تھا۔ اس لئے میں نے ایک معزز تر کی افسر یعنی حسین حبیب آفندی پولیس کشنر سے دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے مینوسپٹی کے ٹیکس بہت کم ہیں۔ بہت سی چیزیں محصول سے معاف ہیں۔ لیکن غلطہ میں یورپین سوداگر خود اپنی خواہش سے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ اس لئے مینوسپٹی ان رقموں کو فیاضی سے صرف کر سکتی ہے۔ مجھے خیال ہوا۔ کہ یہ وہی غلطہ ہے جس کی نسبت ابن بطوطہ نے نجاست اور میلے پن کی سخت شکایت کی ہے۔ یا اب ان کو صفائی و پاکیزگی کا یہ اہتمام ہے کہ اس کے لئے بڑے بڑے ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صفائی اور خوش سلیقگی آج کل یورپ کا خمیر بن گیا ہے *

یہاں کی عمارتیں ہندوستان کی عمارتوں سے بالکل جدا وضع کی ہیں۔ مکانات عموماً سہ منزلہ۔ چو منزلہ ہیں۔ صحن مطلق نہیں ہوتا۔ عمارتیں

نام لکڑی کی ہیں۔ بڑے بڑے اُمر اور پاشاؤں کے محل بھی لکڑی ہی کے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ یہاں آگر آگ لگتی ہے۔ کوئی مہینہ بلکہ ہفتہ خالی نہیں جاتا۔ کہ دو چار گھر آگ سے جلکر تباہ نہوں۔ اور بھی کبھی تو محلے کے محلے جل کر خاک سیاہ ہو جاتے ہیں۔ آگ بجھانے کے لئے سلطنت کی طرف سے نہایت اہتمام ہے۔ کئی سو آدمی خاص اس کام پر مقرر ہیں ایک نہایت بلند منارہ بنا ہوا ہے۔ جس پر چند ملازم ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ کہ جس وقت کہیں آگ لگتی دکھیں۔ فوراً خبر کریں۔ اس قسم کے اور بھی چھوٹے چھوٹے منارے جا بجا بنے ہوئے ہیں۔ جس وقت کہیں آگ لگتی ہے۔ فوراً توپیں سر ہوتی ہیں۔ اور شہر کے ہر حصے سے آگ بجھانے والے ملازم تمام آلات کے ساتھ موقع پر پہنچ جاتے ہیں۔ اُنکو حکم ہے کہ بے تحاشا دوڑتے جائیں۔ یہاں تک کہ اگر کوئی راہ چلتا اُنکی جھپٹ میں آکر پس جائے تو کچھ الزام نہیں۔ میں نے لوگوں سے دریافت کیا کہ پتھر کی عمارتیں کیوں نہیں بنتیں۔ معلوم ہوا کہ سردی کے موسم میں سخت تکلیف ہوتی ہے اور تندرستی کو نقصان پہنچتا ہے +

آپ دہوا یہاں کی نہایت عمدہ ہے۔ جاڑوں میں سخت سردی پڑتی ہے اور کبھی کبھی برف بھی گرتی ہے۔ گرمیوں کا موسم جس کا مجھ کو خود تجربہ ہوا۔ اس قدر خوش گوار ہے۔ کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ ہمارے یہاں کے اُمرائے شملہ اور نینئی تال کی بجائے قسطنطنیہ کا سفر کیوں نہیں کرتے! پانی پاڑ سے آتا ہے۔ اور نہایت باعظم اور

خوش گوار ہے۔

(شبلی نعمانی)

مصر کی قدیم یادگاریں

آثارِ قدیمہ کے لحاظ سے کوئی شہر اس شہر کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ سچ یہ ہے کہ یہاں کی ایک ایک ٹھیکری قدامت کی تاریخ ہے۔ سوا دہر کے دیرانوں میں اس وقت تک سیکڑوں خزفہ ریزے ملتے ہیں جن پر کئی کئی ہزار سال قبل کے حروف و نقوش کندہ ہیں۔ مجکو اتنا وقت بلکہ سچ یہ ہے کہ اتنی ہمت کہاں تھی کہ تمام قدیم یادگاروں کی سیر کرنا البتہ چند مشہور مقامات دیکھے اور انھیں کے حال کے لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

آٹھرام۔ یہ وہ قدیم مینار ہیں جن کی نسبت عام روایت ہے کہ طوفانِ نوح سے پہلے موجود تھے۔ اور اس قدر تو قطعی طور سے ثابت ہے کہ یونان کی علمی ترقی سے ان کی عمر زیادہ ہے۔ کیونکہ جالینوس نے اپنی تصنیف میں اس کا ذکر کیا ہے۔ یہ مینار نہایت کثرت سے تھے یعنی دو دن کی مسافت میں پھیلے ہوئے تھے۔ صلاح الدین کے زمانہ میں اکثر ڈھا دیے گئے۔ ان میں سے جو باقی رہ گئے ہیں۔ اور جن پر خاص طور سے آٹھرام کا اطلاق ہوتا ہے۔ صرف تین ہیں۔ جو سب سے بڑا ہے اُس کی لمبائی چار سو اسی فیٹ یعنی قطب صاحب کی لاٹ سے دگنی ہے۔ نیچے کے چوڑے کا ہر ضلع سات سو چونسٹھ فیٹ ہے۔ مینار کا مکتب

آٹھ کروڑ نوے لاکھ فیٹ ہے۔ اور وزن اڑسٹھ لاکھ چالیس ہزار ٹن اس کی تعمیر میں ایک لاکھ آدمی بیس برس تک کام کرتے رہے۔ جر میں تیس تیس فیٹ لمبی اور پانچ پانچ فیٹ چوڑی پتھر کی چٹانیں ہیں۔ اور چوٹی پہ چوٹی سے چھوٹی ہیں آٹھ فیٹ کی ہیں +

اس کی شکل یہ ہے کہ ایک نہایت وسیع مربع چبوترہ ہے اس پر ہر طرف سے کسی قدر سطح چھوڑ کر دوسرا چبوترہ ہے۔ اس طرح چوٹی ٹھیک اوپر تلے چبوترے ہیں اور ان چبوتروں کے بتدریج چھوٹے ہوتے جانے سے زینوں کی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ تعجب یہ ہے کہ پتھروں کو اس طرح وصل کیا ہے کہ جوڑ یا دلاز کا معلوم ہونا تو ایک طرف چونہ یا مصالح کا بھی اثر نہیں معلوم ہوتا۔ اس پر استحکام کا یہ حال ہے کہ کئی ہزار برس ہو چکے اور جوڑوں میں بال برابر فصل نہیں پیدا ہوا ہے +

ان میناروں کو دیکھ کر خواہ مخواہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کہ جرِ ثقیل کا فن قدیم زمانہ میں موجود تھا۔ کیونکہ اس قدر بڑے بڑے پتھر اتنی بلندی پر جرِ ثقیل کے بغیر چڑھائے نہیں جاسکتے۔ اور اگر اس ایجاد کو زمانہ حال کے ساتھ مخصوص سمجھیں۔ تو جرِ ثقیل سے بھی بڑھ کر کسی عجیب صنعت کا اعتراف کرنا پڑے گا +

ان میناروں میں سے ایک جو سب سے چھوٹا ہے۔ کسی قدر خراب ہو گیا ہے جس کی کیفیت یہ ہے کہ ۹۳۰ شمہ ہجری میں ملک العزیز

پسر سلطان صلاح الدین) نے بعض احمقوں کی ترغیب سے اس کو
 ٹھکانا چاہا۔ چنانچہ دربار کے چند معزز افسر اور بہت سے نقب زن
 اور شکر تراش اور مزدور اس کام پر مامور ہوئے۔ آٹھ مہینے تک برابر
 کام جاری رہا اور نہایت سخت کوششیں عمل میں آئیں۔ ہزاروں لاکھوں
 روپے برباد کر دیے گئے۔ لیکن بجز اس کے کہ اوپر کی استرکاری خراب
 ہوئی یا کہیں کہیں سے ایک آدمہ پتھر اکٹرا گیا اور کچھ نتیجہ نہیں ہوا۔ مجبور
 ہو کر ملک العزیز نے یہ ارادہ چھوڑ دیا۔

احقرام کے قریب ایک بہت بڑا بت ہے جسکو یہاں کے لوگ
 ابوالہول کہتے ہیں۔ اُس کا سارا دھڑلین کے اندر ہے۔ گردن اور سر اور
 دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ چہرہ پر کسی قسم کا سُرخ روغن ملا ہے
 جس کی آب اس وقت تک قائم ہے۔ ان اعضا کی مناسبت سے
 اندازہ کیا جاتا ہے۔ کہ پورا قد ساٹھ ستر گز سے کم نہوگا۔ باوجود اس غیر معمولی
 درازی کے تمام اعضا ناک کان وغیرہ اس ترتیب اور مناسبت سے
 بنائے ہیں۔ کہ اعضا کے باہمی تناسب میں بال برابر کا فرق نہیں۔
 عبداللطیف بغدادی سے کسی شخص نے پوچھا تھا۔ کہ آپ نے دُنیا میں
 سب سے عجیب تر کیا چیز دیکھی؟ اُس نے کہا کہ ابوالہول کے اعضا کا
 تناسب، کیونکہ عالم قدرت میں جس چیز کا نمونہ موجود نہیں۔ اُس میں
 ایسا تناسب قائم رکھنا آدمی کا کام نہیں۔

(شبلی نعمانی)

مولوی عبد کلیم صاحب شرر لکھنوی

بزم قدرت

دنیا کی سب محفلیں تغیرات زمانہ سے درہم و برہم ہو جاتی ہیں۔ مگر خدا کی مرتب کی ہوئی محفل جس میں انقلابات عالم سے ہر روز ایک نیا لطف پیدا ہوتا رہتا ہے ہمیشہ آباد رہی اور پونہیں قیامت تک جی ہوگی۔ یہ وہ محفل ہے جسکی رونق کسی کے مٹانے سے نہیں مٹ سکتی۔ وہ پر غم واقعات اور وجہت بھرے سانچے جسے ہماری محفلیں درہم و برہم ہو جایا کرتی ہیں۔ اُن سے بزم قدرت کی رونق اور دوبالا ہو جاتی ہے۔ ہماری صحبت کا کوئی آشنا حرام نصیبی میں ہم سے بچھڑ کے مبتلاے دشت غربت ہو جاتا ہے۔ تو برسوں ہماری آنکھیں سوئی پڑی رہتی ہیں۔ ہمارے عشرت کدوں کا کوئی زندہ دل نندراجل ہو جاتا ہے۔ تو سالہا سال گئے لئے وہ ماتم کدے ہو جاتے ہیں۔ مگر جب ذرا نظر کو وسیع کرو اور خاص صدقات کا خیال چھوڑ کے عالم کو عام نظر سے دیکھو تو اُس کی چل پھل ویسی ہی رہتی ہے۔ بلکہ نئی نسل کے دو چار پُر جوش زندہ دل ایسے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ کہ دنیا کی دلچسپیاں ایک درجہ اور ترقی کر جاتی ہیں ایک شاعر کا قول ہے

دنیا کے جو مزے ہیں۔ ہرگز یہ کم نہ ہوں گے
چرچے ہی نہیں گے۔ فنون! ہم نہ ہوں گے

جس نے کہا ہے بہت خوب کہا ہے۔ بزم قدرت ہمیشہ یو نہیں دلچسپیوں سے آباد رہے گی ہاں ہم نہ ہونگے۔ اور ہماری جگہ زمانہ ایسے اچھے نعم البدل لاکے بٹھا دیگا

کہ ہماری باتیں محفل والوں کو پھینکی اور بے مزہ معلوم ہونے لگیں گی +
 الغرض یہ محفل کبھی خالی نہیں رہی۔ کوئی نہ کوئی ضرور رہا۔ جو اس بزم کی
 رونق کو ترقی دیتا رہا۔ اسی مقام سے یہ نازک مسئلہ ثابت کیا جاتا ہے۔
 کہ زمانہ کی عام رفتار ترقی ہے۔ ایک قوم آگے بڑھتی اور دوسری پیچھے ہلتی
 ہے۔ تنزل پذیر قوم کے لوگ اپنے مقام پر جب اطمینان سے بیٹھتے ہیں۔ زمانہ
 اور ملک کی شکایتوں کا دفتر کھول دیتے ہیں۔ اور ان کو دعویٰ ہوتا ہے۔ کہ
 زمانہ تنزل پر ہے مگر اصل پوچھیے تو تنزل صرف ان کی غفلتوں اور راحت
 طلبیوں کا نتیجہ ہے دنیا اپنی عام رفتار میں ترقی ہی کی طرف جا رہی ہے +
 اے وہ لوگو! جو شکایت زمانہ میں زندگی کی قیمتی گھڑیاں فضول گزران رہے ہو
 ذرا بزم قدرت کو دیکھو تو کس قدر دلکش اور نظر فریب واقع ہوئی ہے۔
 تمھارے دل میں وہ مذاق ہی نہیں پیدا۔ کہ ان چیزوں کی قدر کر سکو
 یہ وہ چیزیں ہیں کہ انسانی جوش کو بڑھاتی ہیں۔ اور طبیعت میں وہ مفید حوصلے
 پیدا کرتی ہیں۔ جن سے ہمیشہ نتیجے پیدا ہوئے اور پیدا ہوں گے۔ اندھیری
 رات میں آسمان نے اپنے شب زندہ دار دوستوں کی محفل آراستہ کی ہے
 تارے کھلے ہوئے ہیں۔ اور اپنی بے ترتیبی اور بے نظمی پر بھی عجب بہار
 دکھا رہے ہیں۔ دیکھو ان پیارے خوش نامتاروں کی صورت پر کیسی زندہ دلی
 اور کیسی تری و تازگی پائی جاتی ہے؟ پھر کیا ایک مہتاب کا ایسا حسین اور نورانی
 ہمان مشرق کی طرف سے نمودار ہوا۔ اور یہ گورے گورے تارے اپنی
 بے فروغی پر افسوس کر کے غائب ہونے لگے۔ مہتاب آسمان کے نیلگوں طلسمی

دامن میں کھیلتا ہوا آگے بڑھا۔ وہ اگرچہ ہماری طرح دل واغدارے کے آیا تھا لیکن خوش آیا۔ اور ہمارے غربت کدوں کو روشن کر کے بزمِ قدرت میں نہایت لطیف اور خوش گوار دل چسپیاں پیدا کر کے خوشی خوشی صحنِ خلک کی سیر کرتا ہوا مغرب کی طرف گیا اور غائب ہو گیا۔ ابھی آسمان کو اُس مہمان کا انتظار تھا جس سے نظامِ عالم کا سارا کاروبار چل رہا ہے اور جس کی روشنی ہماری زندگیوں کی جان اور ہماری ترقیوں کا ذریعہ ہے۔ آفتاب بڑی آب و تاب سے ظاہر ہوا۔ رات کا خوبصورت اور ہم صحبت چاند اپنے اُترے ہوئے چہرہ کو چھپا کے غائب ہو گیا۔ اور آسمان کا اسٹیج بزمِ قدرت کے دلفریب ایکٹروں سے خالی ہو گیا۔

خوابِ شب کا مزا اٹھانے والوں کی آنکھیں کھل کھل کے اُفقِ مشرق کی طرف متوجہ ہوئی ہیں۔ آفتاب کی شعاعیں آسمان کے دُور پر چڑھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسکے ساتھ مُرفانِ سحر کے نغمہ کی آواز کانوں میں آتی ہے۔ اور آنکھیں ملے دیکھا ہے۔ تو ہماری نظر کی خیرگی نہ تھی۔ شمعِ حقیقت میں جھللا رہی ہے ایک بیک و فور طرب نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا ہے گھنٹہ بجے۔ چڑیاں چھپائیں۔ موزوں نے اذانیں دیں۔ اور تمام جانوروں کی مختلف آوازیں نے بلکہ ایک ایسا ہمہ پیدا کر دیا ہے۔ کہ نیچر کی رفتار میں بھی تیزی پیدا ہو گئی بلکہ نیچر کے چابکدست کارگیر اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئے نسیمِ سحر اٹھیلیاں کرتی ہوئی آئی اور ضابط و متین غنچوں کے پہلو گدگدائے لگی۔ الغرض قدرت نے اپنی پوری بہار کا نمونہ آشکارا کر دیا۔

(عبد کلیم شہر)

خان بہادر شمس العلامولوی محمد ذکاء اللہ وارن ہسٹنگز کے اخلاق و عادات

شاید کوئی اور دوسرا مذہب و تنظیم ملکی ایسا گذرا ہو کہ جس کی تفسیح اور
ہجو اس مبالغہ سے اور تعریف اس شد و مد سے ہوئی ہو۔ اور اس کی
ساری زندگی کے افعال اور اعمال کی تحقیقات ایسی شہادت تحریری
سے ہوئی ہو۔ مگر اس کی نسبت لکھنے والے طرف دار اور متعصب
تھے۔ اگر نظر انصاف سے دیکھیے۔ تو اس میں یہ بھلائیاں اور برائیاں
معلوم ہوئی۔ جو ہم نیچے لکھتے ہیں۔ اس کی فطانت اور فراست
و ذہانت کے سب دوست دشمن قائل ہیں۔ کوئی اس میں شبہ نہیں
کرتا کہ وہ بیدار مغرور ہوشیار دل ایسا تھا کہ امور خطیر و معاملات
عظیم کے انصرام اور مسرا انجام کرنے کی اس میں قابلیت اور
لیاقت تھی۔ برسوں تک اس نے ایک سلطنت بزرگ اور مملکت عظیم
کا نظم و نسق کیا۔ سوائے ذہین اور قابل ہونے کے وہ محنت شعار اور
جفاکش پر لے دیجے کا تھا۔ کاہلی اس سے کروڑوں کوں دود رہتی تھی
اس کے جانشین جو ہوئے۔ ان میں دو چار قابلیت اور لیاقت میں
تو ہم پلہ ہوئے۔ مگر محنت و مشقت و کارگزاری میں کہیں اس سے ملے
تھے۔ یہی پہلا عالی دماغ تھا جس نے یہ سوچا کہ انگریزی گورنمنٹ
سب سے علحدہ رہ کر قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کے لئے ضرور ہے کہ

وہ اور ہندوستانی رئیسوں سے آمیزش اور سازش کرے یہی باب فتح و نصرت کی کنجی ہے۔ یہی وہ روشن عقل تھا کہ اُس شاہراہ پر انگریزی گونیمنٹ کو رستہ دکھایا جس پر چلنے سے وہ اپنی منزل مقصود پر پہونچ گئی گو یہ خیالات اُس وقت انگلستان میں عام پسند نہ تھے۔ مگر بڑی بھلی طرح سے تجربہ ہو کر آخر کار وہی صحیح ثابت ہو گئے۔

اُس نے انگریزی صوبوں کے حسن انتظام میں اپنی عقل و ذہن کو بہت خرچ کیا۔ انقلابوں کے طوفان نے سارے ملک میں اندھیر مچا رکھا تھا۔ کسی سلطنت کا چراغ روشن نہ رکھا تھا۔ شمع افسردہ کی طرح سب میں دھواں نکل رہا تھا۔ مالی اور دیوانی عدالتوں کا بہت بُرا حال تھا۔ وہ نام کی عدالتیں تھیں۔ حقیقت میں اُن کے طفیل وہ ظلم و ستم ہوتے تھے کہ قلم لکھ نہیں سکتا۔ اگر زمیندار تھا۔ تو اداسے مالگداری کے لئے سر اُس کا گنبد بنایا جاتا تھا۔ اگر ساہوکار تھا۔ تو وہ شکنجے میں پھنسا ہوا تھا۔ غرض سارے زمانے کی عافیت تنگ تھی۔ اُس نے ان سب عدالتوں کی اصلاح کی۔ گو ان کو اُس نے درجہ کمال پر نہیں پہونچایا اور نہ ان کو اچھا بنایا۔ مگر وہ ایک بنیاد اُن کی ایسی ڈال گیا۔ کہ پھر اُس پر افروں کو ردے لگا کر عمارت بنانی آسان ہو گئی۔ کوئی حکومت کا کارخانہ ایسا نہ تھا۔ کہ جس کی طرف اُس نے توجہ نہ کی ہو۔ اور اُن میں بہت سی باتوں کا موجود نہ ہو۔

اُس نے اپنی سرکاری ہوا خواہی اور خیر اندیشی میں بھی کوئی دقیقہ

فروگزاشت نہیں کیا۔ مگر اس میں اُس نے اخلاق کی نیکی پر خیال نہیں کیا۔ جس وقت سرکار نے روپیہ مانگا۔ تو اُس کے سرانجام کرنے میں کسی بات کا آگاہی نہیں سوچا۔ ازراہ ظلم و تعدی جو دولت کا سامان کیا اہل انگلستان نے اُس کو بے سرو سامانی سمجھا۔ اُس کی طبیعت کا خمیر ایسا تھا۔ کہ وہ عدالت اور صداقت کو ضرورت کے وقت کچھ چیز نہیں سمجھتا تھا اور مرآت و فتوت کو انسانیت میں داخل نہیں جانتا تھا۔ مگر ضرورت پور پور و اباشد پر عمل تھا۔ وہ خود رائی کے سبب بر خود غلط امتنا تھا۔ کہ اپنے سامنے افلاطون کی بھی حقیقت نہیں جانتا تھا۔ ہر کام اُس کا ایک راز سر بسہ اور سر پوشیدہ تھا۔ کسی کام کی اصل و حقیقت کھلنے ہی نہیں دیتا تھا۔ گو اُس کے ظاہر ہو جانے سے نقصان نہ ہو۔ وجہ اس کی یہ تھی۔ کہ وہ ہر کام کو بڑے ہیچ پانچ سے کرتا تھا۔ غرض اُس میں جو خوبیاں تھیں۔ وہ تحسین کے قابل تھیں۔ اور جو بُرائیاں تھیں۔ وہ نفرین کے لائق۔ یوں سمجھنا چاہیئے۔ کہ رعایا پروری۔ سپاہ کی دلداری۔ لوگوں کو اپنا کر لینا۔ رفاہیت عباد اور معموری بلاد کا خیال یہ سب خوبیاں اُس میں ایسی تھیں۔ کہ وہ ایک طوطی خوش رنگ کی طرح خوش نما معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اپنی سرکار کی نمک شناسی کے سبب سے اُس کی گھینہ مالی دولت افزائی ایسی ایک بلی اُس میں تھی۔ کہ وہ اس طوطی خوش رنگ کو نوچے کھاتی تھی۔ مگر اس بلی کے بھنبوڑنے کے لئے اُس کے پاس ایک کتا بھی موجود تھا۔ جو اُس کی خود پرستی و خود رائی تھی

غرض یہ فضائل اور ذائل اُس میں کام کر رہے تھے جو ایک بڑے
بند مکان میں طوطی اور بٹی اور کٹاکام کرس ہینٹنگر صاحب کی سب
سے زیادہ تعریف اس بات میں تھی۔ کہ اُس نے سارے کارخانوں
اور کاموں کے لئے خود ہی مقدمات کو ترتیب دیا اور اس بات کو سرانجام
کیا۔ جب وہ ولایت سے ہندوستان میں آیا۔ تو طفل مکتب تھا۔ نوکری
ملی تو تجارت کے کارخانے میں کبھی اُس کو اہل علم اور منتظمان ٹکلی کی صحبت
بھی میسر نہ ہوئی۔ جتنے اُس کے یہاں جلس وائیس تھے اُن میں کوئی
اُس سے زیادہ صاحب لیاقت نہ تھا۔ کہ اُس کی لیاقت کو بڑھاتا
بلکہ اُس کو خود استاد بنکر اور سب کو لیاقت کا سبق پڑھانا پڑا۔ وہ
سب کارہنما تھا اور اُس کا رہنما فقط اُس کی عقل و دانش کا نور
تھا۔

(محمود کا وائس)

ادب

ادب کے معنی اُس ریاضت محمودہ اور کوشش وسعی کے
ہیں جس سے کسب و فضیلت ہو۔ ہر چیز کی حد کی نگہداشت کو ادب فعل
محمودہ کی تعظیم کو بھی ادب کہتے ہیں۔
تو اپنے نفس کو وہ ادب رکھا۔ کہ بے ادب اُسے دیکھ کر با ادب
ہو جائیں۔ جو ادب رکھانے کا ذوق رکھتا ہے۔ وہ بے ادبوں کو اپنا
بے سارا لیتا ہے جیسے آہوے وحشی جو گھر میں دانہ کھاتا ہے۔ وہ اور

آہوؤں کو پکڑ لاتا ہے۔ جو اپنے اخلاق کی بنیاد ادب پر رکھتا ہے۔ اُس کا
 فخر استاد ہو جاتا ہے۔ بزرگی کی جڑ ادب سے مستحکم ہوتی ہے ۔
 تولاہ وگل کی طرح تھوڑا سا خندہ کر کہ سب کو مطبوع ہو۔ نہ یہ کہ ایسے
 احمقے لگائے۔ کہ سب کو بیہودہ معلوم ہوں۔ بے خرد جس کو مزاح
 کہتے ہیں۔ وہ خرد مندوں کے نزدیک نبرد و سلاح ہے۔ اگر تمکاری
 واڑھی کوؤں کے پردوں کی سی سیاہ ہو۔ تو بڑھوں کی بگلا سی سفید
 واڑھی کی مہنسی نہ اڑاؤ۔ اگر تم سمن عارض اور گل غدار ہو تو زنگی کے
 سامنے آئینہ رکھ کر اُسے نہ چڑاؤ۔ کیونکہ کوئی بد صورت دُنیا میں بے مصلحت
 نہیں ہوتا۔ ایک چینی جس کا رنگ سُرخ و سفید تھا۔ ایک زنگی پر پٹھا
 تو زنگی نے جواب دیا۔ کہ میرا ایک نقطہ تیرے چہرے کے لئے
 زیب ہے اور تیرا ایک نقطہ میرے لئے ایک عیب ہے۔ تجھے چاہیئے کہ
 جو تیرا عیب ہیں ہو۔ تو اُس کا ہنر دیکھ۔ جو تجھے زہر دے۔ تو اُس کو نبات
 دے۔ جو تجھے مارے۔ تو اُسے آبِ حیات پلا۔ تاکہ تیری عقل سلامت پسند
 ہو۔ اور تیرے نام کا خطبہ اخلاق میں آواز بلند پڑھا جائے۔ خدا سے
 توفیق ادب کی دعا مانگ۔ کیونکہ ادب کے بغیر لطیف رب سے آدمی
 محروم رہتا ہے۔ بے ادب اپنے ہی لئے بُرا نہیں ہوتا۔ بلکہ آذر دں کے
 لئے بھی بُرا نمونہ بنتا ہے۔ ادب انسان کو معصوم بناتا ہے۔ گستاخی
 اور بے باکی غموں کا ہجوم رکھتی ہے ۔

حیا

حیا بھی طرح طرح کی ہوتی ہے اور بیجائی بھی قسم قسم کی۔ سب سے زیادہ سخت بے حیائی اپنی محبت میں اندھا ہونا ہے۔ جس میں اکثر انسان مبتلا ہیں۔ ایک شخص جو سرشتِ انسانی سے بڑا ماہر ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ آدمی اپنے سے سب کے بعد محبت کرے، مگر دنیا میں بہت سے آدمی ایسے دیکھنے میں آتے ہیں کہ وہ سب سے پہلے اپنے سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اپنی ذات میں اُن صفات کا یقین کرتے ہیں جو حقیقت اُن میں نہیں ہوتیں۔ اور اپنی ذات کی قدر و منزلت و قیمت میں مبالغہ کرتے ہیں۔ یہی سخت عیب ہے جس سے انسان جو اپنے سے آپ دھوکا کھاتا ہے۔ اور ذلت اٹھاتا ہے۔ خلق کی نظروں میں حقیر ہو جاتا ہے۔ جب آدمی خود ستائی کرتا ہے اور اس طرح اپنے تئیں دکھانا چاہتا ہے۔ جس سے معلوم ہو کہ وہ کوئی بڑی قابلیت و قدر و منزلت کا آدمی ہے۔ تو ضرور اُس کی ہنسی ہوتی ہے۔ ہم کو چاہیے کہ جب کوئی دوسرا شخص ہماری تعریف کرے۔ تو اُس کو حیا و شرم کے ساتھ قبول کریں۔ ظاہر اور باطن دونوں میں فروتنی اور غرور و تکبر اختیار نہ کرنا چاہیے جب آدمی اپنی نیک صفات کو جو حقیقت میں اُس کے اندر ہیں۔ نمود کے ساتھ دکھائے گا۔ تو شیخی کر لیری ہو جائیگی۔

غرور کرنا بڑی بے حیائی ہے۔ غرور بڑا بے حیا ہوتا ہے۔ غرور اپنی نخوت کے زور سے مصیبتوں کا مقابلہ عیب کرتا ہے۔ وہ اپنے دُنگے

زور سے اپنے سرکش دل کے ٹکڑے کرتا ہے۔ نرم پودا ہوا کے جھوکوں کے آگے سر جھکاتا ہے۔ اور اُس کے تمام زور کو اپنے سے دُور کر دیتا ہے اور خود قائم رہتا ہے۔ ایسے ہی فروتن۔ متواضع۔ منکسر اپنے عجز و انکسار سے بلاؤں کو سر پر سے ٹال دیتا ہے۔

سفلی کم ظرف ناشائستہ اپنی اصلی لیاقتوں کی شیخیاں بگھارا کرتے ہیں سچے مُتدب اور شائستہ اپنے عجز و ناتوانی کو ظاہر کیا کرتے ہیں۔ علم میں جو لوگ حقوڑی لیاقت رکھتے ہیں۔ وہی اپنے عالم ہونے کے بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ مگر حقیقت میں جو عالم علم و نگاہِ ادب و حقیقت آگاہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آگے بہ نسبت پیچھے کے زیادہ دیکھتے ہیں وہ اپنے میں یہ نہیں دیکھتے ہیں۔ کہ ہم کیا جانتے ہیں۔ بلکہ یہ کہ۔ کیا نہیں جانتے جتنا اُن کا علم بڑھتا ہے۔ اُمتنا ہی اپنی جہالت کے علم سے اُن کی جیا زیادہ ہوتی ہے۔ وہ سمندر کے تیراک ہوتے ہیں ایک عمق کے بعد دوسرا عمق اُنکے آگے ہوتا ہے۔ اُسکی تھاہ کبھی اُن کو نہیں ملتی۔ یہ کم علم ندی نالوں کے تیراک ہوتے ہیں۔ کہ جلدی سے تھاہ کو پا کے خوش ہو جاتے ہیں اور اُس پر گھمنڈ اور فخر کرتے ہیں۔ عالموں کی نظروں کے روبرو۔ پہاڑ پر پہاڑ اور ایک ہمالہ پر دوسرا ہمالہ آتا جاتا ہے جس سے اُن کا منظر فراخ ہوتا جاتا ہے جتنا یہ منظر وسیع ہوتا ہے اتنی ہی اُن کو حیا اپنی کوتاہ نظری کی بڑھتی جاتی ہے ۔

(محمد ذکا و اللہ)

محنت

ہر بشر کے پیچھے سب حالتوں میں محنت کرنے کا فرض لگا ہوا ہے خواہ وہ کسی جماعت کا ہو جو شریف شرافت نسبی اور شرافت حقیقی تعلیم و تہذیب کے سبب سے رکھتا ہے۔ وہ اپنے دل سے اس امر کو اپنے اد پر فرض سمجھتا ہے۔ کہ بیہود عوام اور فہانام میں سعی کر کے محنت میں اپنا حصہ لوں۔ اس کو ہرگز یہ گوارا ہے خاطر نہیں ہوتا کہ میں اوروں کی محنت سے کھاؤں پیوں۔ میں فراغت سے رہوں اور اس کا معاوضہ خود محنت کر کے اپنی سوسائٹی کو نہ دوں۔۔۔

عالی خیال نیک کردار اس تصور سے بھاگتا ہے کہ یونہی بیٹھا رہے اور دعوتیں اڑایا کرے۔ اور اس کا معاوضہ کچھ نہ دے۔ نکتا پن اور سستی نہ کوئی عزت ہے نہ کوئی منفعت ہے۔ اس سے فرومایہ اور کمینہ طبائع راضی ہو جائیں۔ مگر عالی ہمت تو ایسی حالت کو مذلت سمجھتے ہیں۔ اور حقیقی عزت اور عظمت سے اُسے بعید جانتے ہیں۔

ایک دانشمند بلند خرد جو خود جدوجہد میں مجتہد تھا۔ وہ اپنے بیٹے کو جو مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ یہ پندشودمند ارقام فرماتا ہے۔ کہ "اے میرے پیارے بیٹے! تیرے دل پر اس بات کا نقش شدت سے زور دے کہ نہیں جاسکتا۔ کہ ہر امیر شریف۔ غریب۔ فقیر کی شرط زندگی محنت ہے۔ غریب کسان روٹی اپنی پیشانی کی عرق ریزی سے کماتا ہے۔ اور امیر اپنے شکار کی جستجو میں سعی کر کے اپنی سستی کو کھوتا ہے۔"

جیسے گیہوں کے کھیت میں بغیر کل چلائے کاشتکار کو کچھ پیداوار ہاتھ نہیں ملتا۔ ایسے ہی مزرعہ دل میں تخمِ علم بغیر محنت کے بار آور نہیں ہوتا۔ مگر ہاں ان دونوں میں اتنا فرق ضرور ہے کہ ایسے اتفاقات اور واقعات پیش آسکتے ہیں کہ ایک کسان کھیت بوئے اور وہ اس کی پیداوار سے محروم رہے اور کوئی دوسرا آدمی اُس سے مستمتع ہو۔ مگر علم میں یہ نہیں ہو سکتا کہ آتش زدگی یا وقوعِ حادثات سے کوئی شخص اپنے مطالعہ علمی کی ریاضت کے ثمر سے محروم ہو جائے اور یہ ثمر دوسرے کو مل جائے۔ اُس کے تحصیلِ علم کی تکمیل اور توسیع خاص اُسی کی ذاتی منفعت کے لئے ہے۔ اسی واسطے میرے پیارے بچے! محنت کر اور وقت کو اچھی طرح کام میں لا، لڑکپن میں ہمارے قدم لکے ہوتے ہیں اور دل ملائم۔ اُس میں علم خوب جڑ پکڑ سکتا ہے۔ آدمی کی بھی عمر میں مثل فصلوں کے ہوتی ہیں۔ کہ اگر ایک فصل کی کاشت میں غفلت کیجیے۔ تو دوسری فصل میں حاصل کچھ نہیں ہوتا پس اگر ہم اپنی طفلی اور جوانی جو خیریت و ربیع کی فصلیں ہیں ضائع کر دیں گے۔ تو بڑھا پا ہمارا۔ کہ کھرا کا موسم ہے نہایت خوار اور ذلیل ہو گا +

(محمد ذکا و اللہ)

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد

محمد حسین نام۔ آزاد مخدس۔ دہلوی۔ فن شعر میں شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد علوم عربیہ و فارسیہ میں خط و انی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی و فارسی کے پروفیسر تھے۔ اُردو میں ان کی نثریاد عالی بکھتی ہے۔ تشبیہ و تمثیل کا استعمال نہایت خوبی و لطافت سے کرتے ہیں۔

اُردو اور انگریزی انشا پر داری پر کچھ خیالات اگر زبان کو فقط اظہار مطالب کا وسیلہ ہی کہیں۔ تو گویا وہ ایک اوزار ہے کہ جو کام ایک گونگے بچارے ہاتھ نادان کے اشارے سے ہوتے ہیں۔ وہی اس سے ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں اس کا مرتبہ ان لفظوں سے بہت بلند ہے۔ زبان حقیقت میں ایک معیار ہے۔ کہ اگر چاہے تو باتوں باتوں میں ایک قلعہ فولادی تیار کر دے۔ جو کسی توپ خانے سے نہ ٹوٹ سکے۔ اور چاہے۔ تو ایک بات میں اسے خاک میں ملا دے جس میں ہاتھ ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ زبان ایک جادوگر ہے جو کہ طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتر سے تیار کر دیتا ہے۔ اور جو اپنے مقاصد چاہتا ہے۔ ان سے حاصل کر لیتا ہے وہ ایک نادر مریض کا رہے۔ کہ جس کی دستکاری کے نونے کبھی شاہوں کے سروں کے تلج اور کبھی شہزادیوں کے نونے ہار ہو جاتے ہیں۔ کبھی علوم و فنون کے خزانوں سے زرو جو اہر اس کے قوم کو مالا مال کرتے ہیں۔ وہ ایک چالاک عیار ہے۔ جو ہوا پر گرہ لگاتا ہے اور دلوں کے

نقل کھوتا اور بند کرتا ہے یا مُصَوِّر ہے۔ کہ نظر کے میدان میں مُرقع
بھینچتا ہے۔ یا ہوا میں گلزار کھلاتا ہے اور اُسے پھول۔ گل۔ طوطی و
ذنب سے سجا کر تیار کر دیتا ہے۔

اس نادور دستکار کے پاس مانی اور بہزاد کی طرح مُوقم اور رنگوں
کی پیالیاں دھری نظر نہیں آتی ہیں لیکن اس کے ہتھاروں اور شبیوں
کے رنگ ایسے خوش نما ہیں کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کر کے لال
چھپا کر دیتا ہے۔ پھر بے اس کے کہ بوندانی نہیں ڈلے۔ ایک ہی بات
میں اسے ایسا کر دیتا ہے۔ کہ کبھی نارنجی کبھی گلناری۔ کبھی آتش۔ کبھی ایسا
بھینا بھینا گلابی رنگ دکھاتا ہے۔ کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔
ایسی طرح یو قلموں اور رنگارنگ اور پھر ستر پاپا عالم نیزنگ۔

جس زبان میں ہم تم باتیں کرتے ہیں۔ اس میں بڑے بڑے نازک
قلم مُصَوِّر گزر گئے ہیں جن کے مُرقعے آجنگ آنکھوں اور کانوں کے
رستے سے ہمارے ہمارے دلوں کو تازہ کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے
کہ آج کل گویا اُنکے قلم گھس گئے ہیں اور پیالیاں رنگوں سے خالی ہو گئی ہیں
جس سے تمہاری زبان کوئی نئی تصویر یا باریک کام کا مُرقع تیار کرنے
کے قابل نہیں رہی۔ اور تعلیم یافتہ قویں اسے سن کر کہتی ہیں۔ کہ یہ نا کامل
زبان ہر قسم کے مطالب ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔

میرے دوستو! یہ قول اُن کا حقیقت میں بیجا نہیں ہے۔ ہر ایک
زبان تعلیم یافتہ لوگوں میں جو عزت پاتی ہے۔ تو دو سبب سے پاتی ہے۔ اول

یہ کہ اُس کے الفاظ کے خزانے میں ہر قسم کے علمی مطالب ادا کرنے کے سامان موجود ہوں۔ دوم اُس کی انشا پر دازی ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں مطالب کے ادا کرنے کی قوت رکھتی ہو۔ ہمارے زبان میں یہ دونوں حقیقتیں ہیں۔ مگر نا تمام ہیں۔ اور اُس کے سبب ظاہر ہیں +

علمی مطالب ادا کرنے کے سامان میں جو وہ مفلس ہے۔ اُس کا سبب یہ ہے کہ تم جانتے ہو۔ گل ڈیڑھ سو برس تخمیناً اُس کی ولادت ہوئے۔ اس کا نام اردو خود کہتا ہے۔ کہ میں علمی نہیں۔ بادر کی زبان ہوں۔ اُس نے بیٹھنے۔ لیکن دین کی باتوں کے لئے کام میں آتی ہوں۔ سلاطین چٹائیہ کے وقت تک اس میں تصنیف و تالیف کا رواج نہ تھا۔ مگر خدا کی قدرت دیکھو۔ کہ ایک بچہ شاہجاں کے گھر میں پیدا ہوا اور انگریزی اقبال کے ساتھ ستارہ چلے۔ جب صاحب لوگ یہاں آئے۔ تو انھوں نے ملکی زبان سمجھ کر اس کے سیکھنے کا ارادہ کیا۔ مگر سوا چند دیوانوں کے اُس میں نشر کی کتاب تک نہ تھی۔ اُن کی فرمائش سے کئی کتابیں۔ کہ فقط افسانے اور داستانیں تھیں۔ تصنیف ہوئیں اور انہی کے ڈھب کی صرف و نحو بھی درست ہوئی ۱۸۳۳ء سے دفتر بھی اردو ہونے شروع ہوئے ۱۸۳۶ء میں ایک اردو اخبار جاری ہوا۔ ۱۸۴۲ء سے دہلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں اسی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں اور اردو دینے پر اسے نام زبان کا تمغہ اور سکہ پایا اب خیال کرنا چاہیے کہ جس زبان کی تصنیفی عمر کل شش ہجری میں کی

ہو۔ اُس کی بساط کیا۔ اور اُس کے الفاظ کے ذخیرے کی کائنات کیا پس
اس وقت ہمیں اُس کی کمی الفاظ سے دل شکستہ ہونا نہ چاہیئے۔

میرے دوستو! کسی زبان کو لفظوں کے اعتبار سے مفلس یا صاحب
سرمایہ کہنا بیجا ہے۔ ہر زبان اہل زبان کے با علم ہونے سے سرمایہ دار
ہوتی ہے۔ اور کسی ملک ولے کا یہ کہنا کہ علمی تصنیف یا بات چیت
میں اپنے ہی ملک کے الفاظ بولیں۔ بالکل بیجا ہے۔

عربی بھی ایک علمی زبان تھی۔ مگر دیکھ لو۔ اُس میں سارے لفظ تو عربی
نہیں۔ صد بارومی۔ صد با یونانی۔ صد با فارسی کے لفظ ہیں وغیرہ
وغیرہ اور زبان فارسی کا تو کچھ ذکر ہی نہیں۔ انگریزی زبان آج
علوم کا سرچشمہ بنی بیٹھی ہے۔ مگر اس میں بھی غیر زبان کے لفظوں کا
طوفان آرہا ہے۔ زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے اہل ملک میں علم
آتا ہے۔ پھر علمی اشیاء کے لئے الفاظ یا تو اُس علم کے ساتھ آتے ہیں
یا وہیں ایجاد ہو جاتے ہیں۔

علمی الفاظ کا ذخیرہ خدا نے بنا کر نہیں بھیجا۔ نہ کوئی صاحب علم
پہلے سے تیار کر کے رکھ گیا۔ جیسے جیسے کام اور چیزیں پیدا ہوتی گئیں
ویسے ہی اُن کے الفاظ پیدا ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ اول خاص
و عام میں علم پھیلتا ہے۔ ساتھ ہی اُس کے الفاظ بھی عام ہوتے ہیں
مثلاً ریل گاڑی اور اُس کے کارخانے کے صد با الفاظ ہیں۔ کہ پہلے
یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب وہ کارخانے ہوئے تو ادھے ادھار

ماخواندے سب جان گئے۔ اگر بے اُس کے وہ الفاظ یہاں دھونڈتے
 یا پہلے یاد کرتے۔ تو کسی کی سمجھ میں بھی نہ آتے۔ ہی طرح مثلاً: جاک نیٹرن
 اس وقت یہاں کوئی نہیں جانتا۔ خواہ اُس کا یہی نام لیں۔ خواہ فانوس جادو
 انیس۔ خواہ اچنبھے کا تماشا کہیں ہرگز کوئی نہیں سمجھے گا۔ لیکن اگر مشاہدے
 میں عام ہو جائے اور گھر گھر میں جاری ہو جائے۔ تو اُن سے اُنٹا اُس کا
 نام رکھ دیں۔ وہی بچے بچے کی زبان پر مشہور ہو جائے گا۔ اور وہی
 سب سمجھیں گے۔

انگریزی میں جو علمی الفاظ ہیں مثلاً ٹیلیگراف یا الیکٹریسیٹی وغیرہ وغیرہ
 ان میں بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ وہ اپنے اصل معانی پر پوری
 دلالت نہیں کرتے مگر چونکہ ملک میں علم عام ہے اور وہ چیزیں عام ہیں
 اس لیے الفاظ مذکورہ بھی ایسے عام ہیں۔ کہ سب بے تکلف سمجھتے ہیں
 پس لفظوں کی کوتاہی ہماری زبان میں اگر ہے۔ تو اس سبب سے ہے
 کہ وہ بے علمی کے عہد میں پیدا ہوئی اور اسی عہد میں پرورش اول
 تربیت پائی۔ اب اس کی تدبیر ہو سکتی ہے۔ تو اہل ملک ہی سے
 ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ خود علوم و فنون حاصل کرو۔ اپنے ملک
 میں پھیلاؤ اور بھائی بندوں کو اُس سے آگاہ کرو۔ جب اُس میں
 سب قسم کے کام پھیل جائیں گے۔ تو اُن کے الفاظ بھی ہونگے۔ ملک
 کے افلاس کے ساتھ زبان سے بھی افلاس کا داغ مٹ جائے گا۔

(محمد حسین آزاد)

تذکرہ ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق

جب وہ صاحب کمال عالم ارواح سے کشور اجسام کی طرف چلا
تو فصاحت کے فرشتوں نے باغ قدس کے پھولوں کا تاج سجایا۔ جن کی
خوشبو شہرت عام بن کر جہان میں پھیلی اور رنگ نے بقائے دوام
سے آنکھوں کو طراوت بخشی۔ وہ تاج سر پر رکھا گیا۔ تو آبِ حیات اُس پر
ختم ہو کر برسا۔ کہ شادابی کو کلامِ اہٹ کا اثر نہ ہو چکے۔ ملک الشعرائی
کا رنگہ اُس کے نام سے موزوں ہوا اور اُس کے طغرائے شاہی میں
نقش ہوا۔ کہ اِس پر نظم اُردو کا خاتمہ کیا گیا۔ چنانچہ اب ہرگز امید نہیں
کہ ایسا قادر الکلام پھر ہندوستان میں پیدا ہو۔ سبب اِس کا یہ ہے
کہ جس باغ کا بلبل تھا۔ وہ باغ برباد ہو گیا۔ نہ ہم صغیر رہے نہ ہم دشتال
رہے۔ نہ اِس بولی کے سمجھنے والے رہے۔ جو خراب آباد اُس زبان
کے لئے نکال تھا۔ وہاں بھانت بھانت کا جانور بولتا ہے شہر
چھاؤنی سے بدتر ہو گیا۔ اُمرا کے گھرانے تباہ ہو گئے۔ گھرانوں کے
وارث علم و کمال کے ساتھ روٹی سے محروم ہو کر حواس کھو بیٹھے۔ وہ
جادو کا طبیعتیں کہاں سے آئیں؟ جو بات بات میں دل پسند انداز
اور عمدہ تراشیں نکالتی تھیں۔ آج جن لوگوں کو زمانہ کی فارغی نے
اِس قسم کی ایجاد و اختراع کی فرصتیں دی ہیں وہ اور اور اصل کی
شاخیں ہیں۔ انھوں نے اُردو پانی سے نشوونما پائی ہے۔ وہ اُور ہی
ہوائوں میں اڑ رہے ہیں۔ پھر اِس زبان کی ترقی کا کیا بھروسہ؟

کیا مبارک زمانہ ہو گا جب کہ شیخ مرحوم اور میرے والد منظور ہم عمر ہونگے تحصیل علمی اُن کی عمروں کی طرح سالت طفلی میں ہوگی صرف و سخن کی کتابیں ہاتھوں میں ہوں گی اور ایک استاد کے دامن شفقت میں تعلیم پاتے ہونگے۔ اُن نیک نیت لوگوں کی ہر ایک بات استقلال کی بنیاد پر قائم ہوتی تھی۔ وہ رابطہ اُن کا عمروں کے ساتھ بڑھتا گیا اور آخر وقت تک ایسا بچہ گیا کہ قرابت سے بھی زیادہ تھا۔ اُن کے تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھیں گے مگر کیا کروں جی ہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گراں بہاد استان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں۔ اُس شعر کے پتلے کا ایک روٹکا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعت کاری کی کل میں کونسے پُرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکال ڈالو۔ یہ کام کا نہیں۔ اور کونسی حرکت اُس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فائدہ نہیں پہنچتا ہے۔ اسی واسطے میں لکھوں گا اور جیات اُن کے سلسلہ حالات میں مسلسل ہو سکے گی۔ اس کا ایک حرف نہ چھوڑوں گا۔

شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے انہیں حالاتِ زمانہ سے ایسا باخبر کر دیا تھا کہ اُن کی زبانی باتیں کتبِ توارخ کے قیمتی سرمایے تھے۔ وہ دلی میں کابلی دروازے کے پاس رہتے تھے۔ اور ذاب لطف علیخان نے

انھیں معتبر اور بالیافت شخص سمجھ کر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے۔ شیخ علیہ الرحمۃ اُن کے اکلوتے بیٹے تھے۔ کہ سن ۱۲۷۱ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ اُس وقت کسے خبر ہوگی۔ کہ اس رمضان سے وہ چاند نیکلے گا۔ جو آسمان سخن پر عید کا چاند ہو کر چلے گا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے۔ تو حافظ غلام رسول نام ایک شخص بادشاہی حافظان کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلہ کے اکثر لڑکے انھیں کے پاس پڑھتے تھے انھیں بھی وہیں بھجوا دیا۔ حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے شوقِ مخلص کرتے تھے۔ اگلے دنوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے محلہ کے شوقین نوجوان دلوں کی اُمنگ میں اُن سے کچھ کچھ کہہ لیا کرتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت اُن کے ہاں یہی چرچا رہتا تھا۔

شیخ مرحوم خود فرماتے تھے۔ کہ وہاں سننے سنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے۔ نظم کے پڑھنے اور سننے میں دل کو ایک روحانی لذت حاصل ہوتی تھی اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھر کرتا تھا۔ دل میں شوق تھا۔ اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا۔ کہ آئی! مجھے شعر کہنا آجائے۔ ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے اور یہ فقط حسن اتفاق تھا۔ کہ ایک حمد میں تھا۔ ایک نعت میں۔ مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا۔ کہ اس مبارک مہم کو خود اس طرح سمجھ کر شروع کرتا۔ کہ پہلا حمد میں ہو۔ اور دوسرا نعت میں۔ جب یہ خیال بھی نہ تھا۔ کہ اس قدر قوی اتفاق کو

بمبارک خاں سمجھوں۔ مگر ان دو شعروں کے موزوں ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی۔ اُس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ انھیں کہیں اپنی کتاب میں۔ کہیں بابجا کا غزوں پر رنگ برنگ کی روشنائی سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو بتاتا تھا۔ اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا۔ غرض کہ اسی عالم میں کچھ۔ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے۔

اسی محلہ میں میر کاظم حسین نام ایک ان کے ہم سن ہم سبق تھے۔ بیقرار مخلص کرتے تھے اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ مگر ذہن کی جودت اور طبیعت کی ترقی کا یہ عالم تھا کہ کبھی برق تھے اور کبھی باد و باران۔ انھیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں اچھے اچھے موقع ملتے تھے۔ شیخ مرحوم اور وہ اتحاد طبعی کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھومتے۔ دور آنے لگے۔

ایک دن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سنائی۔ شیخ مرحوم نے پوچھا یہ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ انھیں سے یہ اصلاح لی ہے۔ شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور ان کے ساتھ جا کر شاگرد ہو گئے۔

سلسلہ اصلاح جاری تھا۔ مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگوں کی واہ و اطبیعتوں کو بلند پروازیوں کے پر لگاتی تھی۔ کہ رشک

جو تلامیذ الرحمن کے آئینوں کا جوہر ہے استاد شاگردوں کو چمکانے لگا بعض موقع پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے ان کی غزل کو دیکھ کر بے اصلاح پھیر دیا اور کہا کہ طبیعت پر زور ڈال کر کہو، کبھی کہہ دیا یہ کچھ نہیں پھر سوچ کر کہو بعض غزلوں کو جو اصلاح دی۔ اُس سے بے ادائی پائی گئی۔ ادھر انھیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا۔ کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزدگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توقہی یا پہلو تہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اس طرح کئی دفعہ غزلیں پھریں بہت سے شعر گٹ گئے۔ زیادہ تر قباحات یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے جو براتی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشد تھے۔ اُن کی غزلوں میں تو ارد سے یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے۔ اس لئے انھیں زیادہ رنج ہوا۔

اگرچہ ان کی طبیعت حاضر فکر رہا۔ بندش چست۔ اُس پر کلام میں زور سب کچھ تھا۔ مگر چونکہ یہ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے۔ نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا۔ نہ کوئی ان کا دوست ہمدرد تھا۔ اس لئے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی۔ اسی قیل وقال میں ایک دن سودا کی غزل پر غزل کہی ”دوش نقش پا۔ آغوش نقش پا، شاہ صاحب کے پاس لے گئے۔ اُنھوں نے خفا ہو کر غزل پھینک دی۔ کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے! اب تو مزارِ نبی سے بھی اونچا اڑنے لگا۔ ان دونوں میں ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بیقرار کر کے گھر سے

کھلا۔ مشاعرہ میں جا کر غزل پڑھی۔ وہاں بہت تعریف ہوئی۔ اُس دن سے
جرات زیادہ ہوئی۔ اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے
اب کلام کا چرچا زیادہ تر ہوا۔ طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سننے والوں
کے دلوں میں اثر برتی کی طرح دوڑنے لگی۔ اُس زمانہ کے لوگ منصف
ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت جو اساتذہ سلف کے یادگار باقی تھے
مشاعرہ میں دیکھتے۔ تو شفقت سے تعریفیں کر کے دل بڑھاتے۔ بلکہ
غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھو کر سنتے +

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ انھیں تو شعر سے کچھ رغبت نہ تھی۔ مگر مرزا
ابوظفر ولیعہد کہ بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے شعر کے عاشق شیدائے
اور ظفر مخلص سے ملک شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اس لئے دربار شاہی
میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے۔ وہیں آکر جمع ہوتے تھے اپنے اپنے کلام
سناتے تھے۔ مطلع اور مصرع جلسہ میں ڈالتے تھے۔ بہرخص مطلع پر مطلع
اگتا تھا۔ مصرع پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار
کہ ولیعہد موصوف کے ملازم خاص تھے۔ اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے
تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہو کرے تو قوت
فکر کو خوب بلند پر دازی ہو۔ لیکن اُس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے
بعد بادشاہی اجازت ہو کر تھی جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔
چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہونچے اور اکثر دربار
ولیعہدی میں جانے لگے +

شاہِ قصیر مرحوم۔ کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے۔ دکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین اُن کی غزل بنانے لگے۔ انھیں دنوں میں جانِ لغزشیں صاحبِ شکار پور سندھ وغیرہ سرحدات سے لیکر کابل تک عہد نامے کرنے کو چلے۔ انھیں ایک میرنشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت و علمیت کے ساتھ امارتِ خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اُس عہدہ پر سفارش کے لئے ولیعہد سے شفقہ چاہا۔ مرزا مظہر بیگ اُن دنوں میں مختار کل تھے اور وہ ہمیشہ اس تاک میں رہتے تھے کہ جس پر ولیعہد کی زیادہ نظر عنایت ہو۔ اُس کو سامنے سے سرکاتے رہیں۔ اس قدر تی پیچ سے میر کاظم حسین کو شفقہ سفارش آسان حاصل ہو گیا اور وہ چلے گئے۔

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولیعہد کے ہاں گئے۔ تو دیکھا کہ تیر اندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انھیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ میاں ابراہیم! آتا تو دکن گئے۔ میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے۔ تم نے بھی نہیں چھوڑ دیا۔ اسی وقت ایک غزل جیب سے نکال کر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو۔ یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سنائی۔ ولیعہد بہادر بہت خوش ہوئے۔ اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو۔ غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کو سرکارِ ولیعہد سے چار روپیہ مہینہ بھی ہو گیا۔

چند سال کے بعد انھوں نے ایک قصیدہ کسکر اکبر شاہ کے دربار

میں سنا یا جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع بدائع صرف کیے تھے۔ مطلع اُس کا یہ ہے:-

جب کہ سلطان واسدہر کا ٹھہرا مسکن
آب و ایلو لہ ہوئے نشو و نما کے گلشن

اِس پر بادشاہ نے "خاقانی ہند" کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی +

اواخر ایام میں ایک بار بادشاہ (بہادر شاہ) بیمار ہوئے۔ جب شفا پائی اور انھوں نے ایک قصیدہ غزلیہ لکھ کر نذر گزارا۔ تو خلعت کے علاوہ خطاب "خان بہادر" اور ایک ہاتھی مع عوضہ نقرئی انعام ہوا۔ پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ لکھ کر گزارا۔ جس کا مطلع یہ ہے:-

شب کو میں اپنے سر پر خواب راحت

نشہ علم میں سر مست غرور و نخوت

۲۳ صفر ۱۱۰۲ ہجری جمعات کا دن تھا۔ ۷۷ دن بیماریہ کرواقت

پائی۔ مرنے سے تین گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا:-

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا

کیا خوب آدمی تھا خدا مقرر کرے

(محمد حسین آزاد)

مرزا اسد اللہ خاں غالب

اسد اللہ خاں نام۔ مرزا نوشہ عرف۔ چندے آسہ پھر غالب تخلص کیا۔ سرکار شاہی سے
 بنجم الدولہ و سیر الملک خطاب تھا۔ سرکار انگریزی سے نیشن پاتے تھے۔ اکبر آباد مولد و دہلی مسکن۔
 ۱۸۶۹ء میں بعمر ۳۲ سال راہی ملک بقاء ہوئے۔ ان کا کلام زیادہ تر فارسی ہے۔ اردو میں
 ایک مختصر دیوان اور ایک مجموعہ رقصات ہے۔ اس زمانہ میں متغلی نویسی کی وبا عام ہو رہی تھی
 مرزا نے بھی اس کی رعایت کی۔ مگر محاورہ کو اندھا کا نا نہیں بننے دیا۔ اس کے علاوہ لمبے چوڑے
 القاب و آداب اور تکلفات لایعنی سے انشائے اردو کو پاک کیا وہ اپنے رقصات کی نسبت
 خود فرماتے ہیں میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے۔ کہ مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کو س
 سے بزبان قلم بائیں کیا کرو۔ ہجر میں وصال کے مزے یاد کرو۔“

خط ۱

برخوردار! تمہارا خط پہونچا۔ لکھنؤ کا کیا کہنا ہے! وہ ہندوستان کا بغداد
 تھا۔ اللہ اللہ! وہ سرکار امیر گر تھی۔ جو بے سرد پا وہاں پہونچا امیر بن گیا
 اس باغ کی فیصل خزاں ہے۔ میں بہت خوشی سے تم کو اطلاع دیتا
 ہوں۔ کہ اردو کا دیوان فاصد بانا انصاف سے ہاتھ آ گیا۔ اور
 میں نے نور چشم منشی شیونرائن کو بھیج دیا۔ یقین لگتی ہے کہ وہ چھاپیں گے
 جہاں تم ہو گے۔ ایک نسخہ تم کو پہونچ جائے گا۔
 طریقہ سعادت مندی یہ ہے۔ کہ ہم کو اپنی خیر و عافیت کا طالب
 جانکر جہاں جائو۔ وہاں سے خط لکھتے رہو۔ اور اپنے مسکن کا پتا ظاہر کرتے رہو
 ہم تم سے راضی ہیں اور چونکہ تمہاری خدمت اچھی طرح نہیں کی

شرمندہ بھی ہیں +

راقم اسد اللہ خاں

مرقومہ شنبہ روز عید مطابق ۳۰ جون ۱۳۸۶ء

خط ۲

اجی مرزا فتنہ! تم نے روپیہ بھی کھویا اور اپنی فکر کو اور میری اصلاح کو بھی ڈبویا۔ پاپے! کیا بُری کاپی ہے! اپنے اشعار کی اور اس کاپی کی مثال جب تم پر کھلتی کہ تم یہاں ہوتے اور نیکیات قلعہ کو پھرتے چلتے دیکھتے۔ صورت ماہ دو ہفتہ کی سی اور کپڑے میلے۔ پاپے لیر لیر۔ جوتی ٹوٹی یہ مبالغہ نہیں بلکہ بے تکلف سنبھلتاں ایک معشوق خوب رو ہے یہ لباس ہے۔ بہر حال دونوں لڑکوں کو دونوں جلیں دیدیں اور معلم کو حکم دیا کہ اسی کا سبق دے۔ چنانچہ آج سے شروع ہو گیا +

مرقومہ صبح ۹ شنبہ ۹ ماہ اپریل ۱۳۸۶ء

(غالب)

خط ۳

اومیاں سید زادہ آزادہ! دلی کے عاشق دلدادہ!

اور دوبارہ کے رہنے والے! احد سے لکھنؤ کو بُرا کہنے والے! نہ دل میں ہیر و آزرم نہ آنکھ میں حیا و شرم۔ نظام الدین ممنون کہاں؟ ذوق کہاں؟ مومن خاں کہاں؟ ایک آزردہ سو خاموش دوسرا غالب وہ بخود دہر ہوش۔ نہ سخنوری رہی۔ نہ سخن دانی۔ کس برستے پر

تپا پانی۔ ہاے دلی! ہاے دلی! بھاڑ میں جائے دلی! سُنو صاحب! پانی پیت کے رُئیوں میں ایک شخص ہیں احمد حسین خاں ولد سردار خاں ولد دلاور خاں اور نانا اُس احمد حسین خاں کے غلام حسین خاں۔ ولد مصاحب خاں اس شخص کا حال از روئے تحقیق مَشرَح اور مُفَصِّل لکھو۔ قوم کیا ہے؟ معاش کیا ہے؟ طریق کیا ہے؟ عمر کیا ہے۔ یاقوت ذاتی کا کیا رنگ ہے؟ طبیعت کا کیا ڈھنگ ہے؟ بھائی! لکھ اور جلد لکھ ۞

(غالب)

خط ۴

بھائی! تم کیا فرماتے ہو؟ جان بوجھ کر اسخان بنے جاتے ہو۔ واقعی غدر میں میرا گھر نہیں لٹا۔ مگر میرا کلام میرے پاس کب تھا کہ نہ لٹتا؟ ہاں بھائی ضیاء الدین خاں صاحب اور ناظر حسین مرزا صاحب ہندی اور فارسی نظم و نثر کے مثنویات مجھ سے لیکر اپنے پاس جمع کر لیا کرتے تھے۔ شوآن دونوں گھروں پر بھاڑ پھیر گئی۔ نہ کتاب رہی۔ نہ اسباب رہا۔ پھر اب میں اپنا کلام کہاں سے لاؤں؟ ہاں تم کو اطلاع دیتا ہوں۔ کہ مئی کی گیارہ صویں شہنشاہ سے جولائی کی اکتیسویں شہنشاہ تک پندرہ مہینے کا اپنا حال میں نے نثر میں لکھا ہے۔ اور وہ نثر فارسی زبان قدیم میں ہے کہ جس میں کوئی لفظ عربی نہ آئے اور ایک قصیدہ فارسی متعارف عربی و فارسی ملی ہوئی زبان میں حضرت فلک رفعت جناب ملکہ معظمہ انگلستان کی سائنس میں

اس نشر کے ساتھ شامل ہے۔ یہ کتاب مطبع مفید خلایق آگرہ میں منشی
بنی بخش صاحب حقیر اور مرزا حاتم علی بیگ تھراور منشی ہرگوپال تفتہ
کے اہتمام میں چھاپی گئی ہے۔ فی الحال مجموعہ میری نظم و نشر کا اسکے سوا
اور کہیں نہیں۔ اگر جناب منشی امیر علی خاں صاحب میرے کلام کے مشتاق
ہیں۔ تو نسخہ موسوم بہ دستنبو مطبع مفید خلایق آگرہ سے منگالیں +
(غالب)

خط ۵

خاں صاحب عالی شان مردان علی خاں صاحب کو فقیر غالب
کا سلام۔ نظم و نشر دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ آج اس فن میں تم کہتا ہو
اتحاد کو سلامت رکھے۔ بھائی جفا کے مونث ہونے میں اہل دہلی و لکھنؤ
کو باہم اتفاق ہے۔ کبھی کوئی نہ کہے گا۔ کہ جفا کیا۔ ہاں بنگالہ میں جہاں
بولتے ہیں۔ کہ ہتھی آیا۔ اگر جفا کو نہ کہیں تو کہیں ورنہ ستم و ظلم و بیداد
نہ کہے اور جفا مونث ہے بے شبہ و شک والسلام +
(غالب)

خط ۶

بندہ نواز زبان فارسی میں خطوں کا لکھنا پہلے سے متروک ہے
پیرانہ سری و ضعف کے صدموں سے محنت پڑو ہی و جگر کا دی کی
قوت مجھ میں نہیں رہی۔ حرارت غریزی کو زوال ہے اور یہ حال ہے :-

مضمحل ہو گئے قومی غالب وہ عناصر میں اعتدال کہاں
 کچھ آپ ہی کی تخصیص نہیں سب دوستوں کو جسے خط و کتابت تہی
 ہے اُردو ہی میں نیازِ نلے لکھا کرتا ہوں جن جن صاحبوں کی خدمت
 میں آگے میں نے فارسی زبان میں خطوط و مکاتیب لکھے اور بھیجے
 تھے۔ اُن میں سے جو صاحب الی الاَن ذمی حیات و موجود ہیں اُن سے
 بھی عند الضرورت اسی زبان مروج میں مکاتبت و مراسلت کا اتفاق
 ہوتا ہے۔ پارسی مکتوبوں۔ رسالوں۔ نسخوں اور کتابوں کے مجموعے
 خیرازہ بستہ ہو کر اطراف و اقصائے عجم میں پھیل گئے۔ حال کی نشریں
 کو کون فراہم کرنے جائے۔ جاں کنی کے خیالات نے مجھ کو ان کی تحریر
 سے دست بردار و آزاد و سبک دوش کر دیا۔ جو نشریں کہ مجموع
 ویک جا ہو کر جہاں جہاں منتشر ہو گئی ہیں اور آئندہ ہوں انھیں کو
 جناب احدیت جلّت عظمتہ مقبول قلوب اہل سخن و مطبوع طبائع
 ارباب فن فرمائے۔ میں اب انتہائے عمر ناپائدار کو پہونچ کر آفتاب لب بام
 اور ہجوم امراض جسمانی و آلام روحانی سے زندہ در گور ہوں۔ کچھ یا دخل
 بھی چاہیے۔ نظم و نشر کی قلم و کا انتظام ایزد دانا تو انا کی عنایت و اعانت
 سے خوب ہو چکا۔ اگر اُس نے چاہا۔ تو قیامت تک میرا نام و نشان
 باقی و قائم رہے گا۔ پس امیدوار ہوں۔ کہ آپ انھیں نذر و محقرہ یعنی
 تحریرات روزِ مرہ اُردو سے سادہ و سرسری کو تا امکان غنیمت
 جان کر قبول فرماتے رہیں اور درویش دلریش و فروماندہ کشاکش

معاصی کے خاتمہ بخیر ہونے کی دعا مانگیں۔ اللہ بس ماسوئے ہوس تعقید
معنوی کو حضور خود جانتے ہونگے۔ اس کی توضیح و تفصیل میں تحصیل حاصل
و تطویل لا طائل کی صورت نظر آتی ہے۔ لہذا خامہ فرسائی بروئے کار
نہیں آئی *

(غالب)

خط ۷

سبحان اللہ! سرآغاز فضل میں ایسے ثمر پائے پیش رس کا پہونچنا
نوید ہزار گو نہ میمنت و شادمانی ہے۔ یہ ثمر رب الثوع اثمار ہے۔ اس کی
تعریف کیا کروں۔ کلام اس باب میں کیا چاہتا ہوں۔ کہ میں یاد رہا اور
اہد اکا آپ کو خیال آیا۔ پروردگار آپ کو بایں ہمہ رواں پردی
و کرم گسری و یاد آوری سلامت رکھے۔ جمعہ کے دن دوپہر کے وقت
کہا رہو پنچا اور اسی وقت جواب لے کر اور آم کے دو ٹوکریے دیکر
روانہ ہو گیا یہاں سے اُس کو حسب الحکم کچھ نہیں دیا گیا۔

(غالب)

خط ۸

جناب قاضی صاحب کو میری بندگی پہونچے۔ مگر می مولوی غلام غوث
خاں صاحب بہادر شیر نشی کا قول سچ ہے۔ اب میں تندرست ہوں بھوڑا
پھنسی کہیں نہیں۔ مگر ضعف کی وہ شدت ہے۔ کہ خدا کی پناہ!
ضعف کیونکر نہ ہوا برس دن صاحب فراش رہا ہوں۔ شرب برس کی

عمر جتنا خون بدن میں تھا بے مبالغہ آدھا اُس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا
رسن کہاں؟ جواب پھر تولید دم صالح ہو۔ بہر حال زندہ ہوں
اور ناتوان اور آپ کی پُرسشہا سے دوستانہ کامنوں احسان
والسلام مع الاکرام؟

(غالب)

خط ۹

پیر و مرشد! نواب صاحب کا وظیفہ خوار گویا اس در کا فقیر تکیہ دار
ہوں۔ مسند نشینی کی تہنیت کے واسطے رام پور آیا میں کہاں اور بریلی
کہاں! ۱۳۔ اکتوبر کو یہاں پہنچا۔ بشرط حیات آخر دسمبر تک دہلی جاؤنگا
نمائش گاہ بریلی کی سیر کہاں اور میں کہاں! خود اس نمائش گاہ کی سیر سے
جس کو دُنیا کہتے ہیں۔ دل بھر گیا۔ اب عالم بیرنگی کا مشتاق ہوں
لا الہ الا اللہ۔ لا موجد الا اللہ۔ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ۔

(غالب)

خط ۱۰

قبلہ! آپ بے شک ولی صاحب کرامت ہیں۔ کم و بیش ایک
ہفتہ گذرا ہوگا۔ کہ ایک امر جدید مقتضی اس کا ہوا۔ کہ آپ کو اس کی
اطلاع دوں خانہ کاہلی خراب! آج لکھوں۔ کل لکھوں۔ اب کون
لکھے! کل صبح کو لکھوں گا۔ صبح ہوئی۔ غالب! اس وقت نہ لکھ۔ سہ پہر
کو لکھیو۔ آج دو شنبہ ۲۳۔ جولائی کی بارہ پر دو بجے ہر کارہ نے

آپ کا خط دیا۔ پلنگ پر پڑے پڑے خط پڑھا اور اسی طرح جواب لکھا۔ اگرچہ
ڈاک کا وقت نہ رہا تھا۔ مگر بھجوا دیا۔ کل روانہ ہو رہے گا۔ آپ کو معلوم
رہے۔ کہ منشی حبیب اللہ ذکا اور نواب مصطفیٰ خاں حسرتی کو کبھی اردو
خط نہیں لکھا۔ ہاں ذکا کو غزل اصلاحی کے ہر شعر کے تحت میں نشانے
اصلاح سے آگئی دی جاتی ہے۔ نواب صاحب کو یوں لکھا جاتا ہے۔
”کما ر آیا خط لایا۔ آم پہونچے۔ کچھ بانٹے۔ کچھ کھائے۔ بچوں کو دعا۔
بچوں کی بندگی۔ مولوی الطاف حسین صاحب کو سلام“ یہ تقریر اس ہفتہ
میں گئی ہے۔ غرض کہ حامیانہ لکھنا اختیار کیا ہے۔ اب یہ عبارت
جو تم کو لکھ رہا ہوں۔ یہ لائق شمول مجموعہ نثر اردو کہاں ہے! یقین جلتا ہوں
کہ ایسی نثروں کو آپ خود نہ درج کریں گے۔ کتاب کے باب میں سرمد کی
رباعی کا شعر اخیر لکھ دینا کافی ہے۔

عالم ہمہ مرآت جمال ازلی ست مے باید دید و دم نے باید زد
بوستان خیال کا ترجمہ موسوم بہ حدائق الانظار معرض طبع میں ہے
اگر آپ یا آپ کا کوئی دوست خریدار ہو۔ تو جتنے مجلد فرمائیے۔ اُس قدر
بھجوا دوں۔ چھ روپیہ مع محصول ڈاک قیمت ہے۔ اُسی مطبع میں جس میں
حدائق الانظار کا انطباع ہوا ہے۔ اخبار بھی چھاپا جاتا ہے۔ اب کے
ہفتہ کو دو ورقہ بھیج دوں گا۔ بشرط پسند آپ تو فیق خریداری لکھ بھیجے گا
جناب کیمن صاحب افسر مدارس غرب و شمال کا باوجود عدم
تعارف خط مجھ کو آیا۔ کچھ اردو زبان کے طور کا حال پوچھا تھا۔ اُس

کا جواب لکھ بھیجا۔ نظم و نثر اردو طلب کی تھی۔ مجموعہ نظم بھیج دیا نثر کے باب میں تمھارا نام نہیں لکھا۔ مگر یہ لکھا کہ مطبع الہ آباد میں وہ مجموعہ چھاپا جاتا ہے۔ بعد اظہار و حصول اطلاع وہاں سے منگا کر بھیج دوں گا۔
زیادہ حد ادب۔ نامہ جواب طلب ۛ

(غالب)

خط ۱۱

قبلہ اسپری و صد عیب۔ ساتویں دہائی کے مہینے گن رہا ہوں
تولج آگے دوری تھا۔ اب دائمی ہو گیا ہے۔ مہینا بھر میں پانچ سات
بار فضول مجتہدہ دفع ہو جاتے ہیں اور یہی منشاء حیات ہے۔ غذا کم ہوتے
ہوتے۔ اگر مفقود نہ کہو۔ تو بئر لہ مفقود کہو۔ پھر گرمی نے مار ڈالا ایک
حرارت غریبہ جگڑیں پاتا ہوں جس کی شدت سے بھنا جاتا ہوں۔ اگرچہ
جرعہ جرعہ پیتا ہوں۔ مگر صبح سے سوتے وقت تک نہیں جانتا۔ کہ کتنا
پانی پی جاتا ہوں + میرے ایک رشتہ کے بھتیجے نے بوستان خیال
کا اردو ترجمہ کیا ہے۔ میں نے اس کا دیباچہ لکھا ہے۔ ایک دو ورقہ
اس کا نہ بصورت پارسل بلکہ بلفٹ خط ہذا بھیجتا ہوں۔ آپ کا مقصود دیباچہ
ہے۔ سو نقل کر لیجیے۔ میرا تذکار اس دو ورقہ کے ارسال سے یہ ہے
اگر آپ کی پسند آئے یا اور اشخاص خریدنا چاہیں۔ تو چھ روپیہ قیمت
اور محصول ذمہ خریدار ہے ۛ

(غالب)

از مؤلف

جنگ مرہٹہ و درانی

احمد شاہ والی کابل ہندوستان پر تین حملے کر چکا تھا اور صوبہ پنجاب کو مالک محروسہ میں شامل کر کے نجیب الدولہ رہیلہ کو شاہ دہلی کی امداد کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ مگر مغلیہ امرا کو خود غرضی اور نا اتفاقی کے مرض نے ایسا چر لیا تھا کہ ایک کو ایک کھائے جاتا تھا۔ اداھر عماد الملک وزیر دہلی مرہٹوں اور جاٹوں کو نجیب الدولہ پر چڑھا لایا۔ اداھر آدینہ بیگ خاں سابق صوبہ دار پنجاب نے مرہٹوں اور سکھوں کی کمک لے کر دُڑانیوں کو اٹک پار بھگا دیا۔ اب سواحل دکن سے وادی اٹک تک مرہٹوں کا پھر پراہر رہا تھا اور ہندوستان کی کھونٹ کھونٹ میں اُن کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ناچار نجیب الدولہ نے احمد شاہ کو عرضی لکھی۔ کہ حضور والا جلد تشریف لائیں اور ہماری تنگ و ناموس کو مرہٹوں کے دستِ تقدی سے بچائیں ورنہ یہ قوم سخت مغلیہ کو اکٹ دیگی اور ہمارا نام و نشان ہندوستان سے مٹا دیگی۔

اس عرضداشت کو پڑھ کر احمد شاہ پھر عازم ہند ہوا اور زیر دامن کوہِ ہمالہ کوچ کرتا ہوا۔ بلا تعرض سہارنپور تک آ پہنچا۔ یہاں نجیب الدولہ اور حافظ رحمت خاں وغیرہ سردارانِ رہیلہ باریاب ملازمت ہوئے اور دُڑانی فوج کی کمک لے کر مرہٹوں کو نواحِ دہلی سے مار پیٹ کر کھال دیا

اور جب تک چیل پار نہ ہو گئے۔ اُن کا پیچھا نہ چھوڑا۔
 مرہٹوں کا سردار رانگھویاجی۔ ہندوستان سے جب اس ناکامی
 کے ساتھ واپس گیا۔ تو بھاؤ جو مرہٹوں کا وزیر اعظم اور سپہ سالار تھا
 اُس کے دل میں غیظ و غضب کی آگ بھڑکی۔ اس وقت مرہٹوں کا
 اقتدار انتہائے عروج پر پہنچ گیا تھا۔ آراستہ رسالے۔ باقاعدہ لٹینیں۔
 اور عمدہ توپخانے اُن کے پاس موجود تھے۔ اُن کے دربار کی شان و
 شکوہ بھی مغلیہ دربار سے ہمسری کا دم بھرتی تھی۔ لہذا بھاؤ ایک
 لشکر عظیم فراہم کر کے بڑے کڑو فر کے ساتھ دلی کی طرف روانہ ہوا۔ تاکہ
 مغلیہ سلطنت کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دے اور اس کا رخ کن
 کی اینٹ سے اینٹ بجادے۔ جب وہ دلی کے زیرِ فسیل آ پہنچا۔ تو
 درانیوں کی قلیل جماعت ایک خفیف مقابلہ کے بعد پس پا ہو گئی۔ بھاؤ نے
 دلی پر قابض ہو کر مساجد و مقابر اور محلات شاہی کو خوب تاراج کیا۔
 دربار عام کا تقریبی کٹھرا کھڑا کر اور بیگیاں کا زیور تک اُتر داکر
 گلاڈالا۔ اگر اُور سردار مانع و مزاحم نہ ہوتے۔ تو بھاؤ آمادہ تھا کہ
 بسو اس راؤ کو تخت دہلی پر بٹھائے اور چار دانگ ہند میں مرہٹوں
 کا سکہ چلائے۔ مگر یہ کام اس وقت تک ملتوی کیا گیا۔ کہ درانیوں کو
 ہزیمت دے کر انک پار بھگا دیں۔ اس لئے مرہٹوں کا لشکر آگے
 بڑھا اور کنج پورہ کے قلعہ کو جہاں معدودے چند درانی قابض و متصرف
 تھے محصور کر لیا۔

اس وقت احمد شاہ دُرانی لنگکانارے انوپ شہر کے مقام پر چھاؤنی ڈالے پڑا تھا اور شجاع الدولہ کو اپنی رفاقت پر مائل کر رہا تھا مرہٹوں کی پورش کے اخبار وحشت آٹار سُکر اُس نے چھاؤنی توڑی اور محصورین پنج پورہ کی اعانت کے لیے بریدیل استعمال روانہ ہوا۔ باغیت کے گھاٹ اُس نے دریائے جمن کو عبور کرنا چاہا۔ مگر دریاتھا طغیانی ہو اور اسباب گزارہ مفقود ناچار اور آگے بڑھا اور کنج پورہ کے محاذات میں پہونچ کر اُس نے ایک تیر تر کش سے نکالا۔ اُس پر کچھ دم کر کے دریا میں پھینکا اور لشکر کو حکم دیا۔ کہ فوراً گھوڑے دریا میں ڈال دو۔ وہ خدا کے حکم سے تم کو راستہ دیگا۔ اس تدبیر سے اس کا سارا لشکر پار اُتر گیا یہاں خبر لگی۔ کہ ایک دستہ فوج مرہٹہ کا سنبھالکے کے سرے پر قابض ہے۔ لہذا قشون دُرانی کا ہراول اُن کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا اور کامیاب ہوا۔ اگرچہ یہ چھوٹی سی فتح تھی۔ مگر دُرانی لشکر اسکو فال فیروزی سمجھ کر بہت خوش ہوا۔

اب دُرانیوں کی آمد آمد سن کر مرہٹوں نے بھی کنج پورہ سے کوس مراجعت بجایا اور دونوں لشکر نواحی پانی پت میں خیمہ زن ہوئے مرہٹوں کے لاؤ لشکر کی بھٹی بھاڑ اس قدر تھی۔ کہ آج تک نہ لاکھ نیزہ زبان عوام ہے۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ جنگ مہا بھارت کے بعد سرزمین ہند میں ایسا جھگڑ فوجوں کا کبھی نہیں ہوا۔ خیر یہ سب مبالغہ سی مگر اس میں شک نہیں۔ کہ مرہٹوں کی جمعیت مع بہیروننگاہ بقول

بعض تین لاکھ اور بقول بعض پانچ لاکھ کے قریب تھی خاص قشون وڈانی
چالیس ہزار اور ہندوستانی سرداروں کی ماتحت فوجیں پچاس ہزار
تھیں۔ مہلوں کا تو پچانہ دس سو توپوں سے زیادہ مگر دیہاتیوں کی طرف
صرف تیس توپیں تھیں۔

کچھ عرصہ تک دونوں لشکر مقابل ہمدگر پڑے رہے اور چھوٹی چھوٹی
لڑائیاں ہوتی رہیں۔ چنانچہ ایک بار بھاؤ کے حکم سے گوبند رائے بندیلہ
ایک دستہ فوج کا لیکر رہسلیکنڈ واو دھ پر تاخت کرنے کے لئے نکلا
ہندوستانی سرداروں نے یہ خیر شاہ وڈانی کو پہونچائی۔ شاہ نے سردار
عطائی خاں کو جو قندھار سے تازہ وارد ہوا تھا۔ اُس کے مقابلہ کو
روانہ کیا۔ سردار مذکور اپنے ماتحت سواروں اور کچھ پھیلوں کو ساتھ
لے راتوں رات یلغار کر کے صبح دم گوبند رائے کی فوج پر ٹوٹ پڑا اور
اُس کو تھس تھس کر کے گوبند رائے کا سر شام تک بادشاہ کے سامنے لا رکھا
گاہ بیگاہ رسد لانے والے گروہوں میں بھی بھڑپ ہو جاتی تھی۔ غرض کئی
مہینے تک پڑے پڑے طرفین کے سپاہی اور سردار تنگ آ گئے
ادھر تو ہندوستانی سردار احمد شاہ سے ملتی ہوئے۔ کہ ایک فیصلہ
کی جنگ کیجیے۔ جو ہونا ہو سو ہو جائے۔ ادھر مرہٹے سردار بھاؤ سے
مقاضیئے۔ کہ لشکر میں غلہ اور سامان کا قحط ہے۔ یوں فاقوں مرنے
سے تو بہتر ہے۔ کہ ہر سر میدان لڑ کر مریں۔

آخر کار شجاع الدولہ کی وساطت سے مرہٹوں نے صلح کا پیغام

بھیجا۔ احمد شاہ نے جواب دیا۔ کہ جنگ و پیکار کا معاملہ میری رائے پر رکھو اور صلح کرنی ہو تو تم لوگ مختار ہو۔ جو اپنے حق میں مصلحت سمجھو کرو۔ شجاع الدولہ تو صلح و آشتی پر مائل تھا۔ الانجیب الدولہ اُڑ بٹھا اور سب ہندوستانی سرداروں کو سمجھایا۔ کہ اگر اس وقت مرہٹے کو رے نکل گئے تو یاد رکھنا کہ آئندہ تمھاری خیر نہیں غرض صلح کا معاملہ چھپیے میں پُر گیا۔ دو ٹوک فیصلہ قرار نہ پایا۔

ابھی پیک و پیام آ جا رہے تھے۔ کہ آخر شب کو جاسوسوں نے خبر دی کہ مرہٹوں کا لشکر ایک زبردست حملہ کی تیاری میں مصروف ہے۔ یہ خبر شجاع الدولہ نے احمد شاہ کو پہنچائی۔ وہ اپنے خیمہ سے ہتھیار لگائے باہر آیا اور فوج کو آگے بڑھنے کا حکم سنایا۔ مگر شاہ کو اس خبر کی صحت میں ہنوز تردد تھا۔ کہ یکا یک مرہٹوں کے توپخانہ کی زبردست فیر نے اُس کی تصدیق کر دی +

جب مرہٹوں کا توپخانہ آہستگی آگے بڑھنا چلا آیا۔ یہاں تک کہ اُسکے گولے دُڑانی لشکر کے سر پیر سے گزرنے لگے۔ تو مرہٹوں کے جنرل ابراہیم کر دی نے فیر بند کر دی اور اپنی پلٹنوں کو آگے بڑھا کر سنگینوں سے حملہ کیا۔

اِس حملہ نے روہیلوں کی صف کو جو دراہینوں کے بازوئے راست کی محافظ تھی بالکل زیر و زبر کر دیا۔ اور اِس کے ساتھ ہی ایک دم فوج سے بسو اس راؤ نے دراہینوں کے قلب لشکر پر جہاں احمد شاہ

کا وزیر حکمرانی کر رہا تھا سخت یورش کی۔ اس حقیقت میں وزیر کا برادر زادہ عطائی خاں کام آیا اور دُرائیوں کے قدم اکھڑنے لگے یہ کیفیت دیکھ کر وزیر اور اُس کے رفقا گھوڑوں سے کود پڑے اور عزم باجمہم کر لیا کہ بغیر مَرے مارے میدان کو ہاتھ سے نہ دینگے۔

اس وقت گردوغبار کی وجہ سے ہنگامہ نبرد کا کچھ حال معلوم نہ ہوتا تھا کہ کون غالب اور کون مغلوب ہے؛ مگر دُرائیوں کے نعرے اور ان کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ کم ہوتی جاتی تھی۔ اس لئے محمد شاہ نے فوراً ایک دستہ وزیر کی کمک کے لئے عقب سے روانہ کیا اُس کے پہنچتے ہی پھر گرما گرمی سے آتش جدال و قتال مشتعل ہو گئی اور خوب جھگڑا گما گمی سے لڑائی ہونے لگی۔ طرفین کے دلاور شور و مادرت بدست اور سینہ بسینہ ڈٹ گئے۔ کہیں تلوار سے تلوار اور کہیں کھانڈے سے کھانڈا بج رہا تھا۔ نیزوں کی سانیں اور سنگینوں کی ٹھکیں برق خاٹت کے مانند کوندہ ہی تھیں بھاؤ اور بسواس اپنی فوجوں کو بڑھا بڑھا کر مردانہ طور پر رہے تھے۔ ظاہر امر ہٹوں کا پلہ بہت بھاری سی نظر آتا تھا۔ اور دُرائی دبتے چلے جاتے تھے۔ مگر عین وقت پر احمد شاہ کو وہ چال سوجھی کہ طرفہ العین میں بازی کا رنگ بدل گیا۔ اُس کی ہدایت کے مطابق سواران صف شکن کا دستہ جو اُس کی فوج کا چیدہ حصہ تھا۔ گھوڑوں کو سرپٹ اڑاتا۔ کاوا کاٹ کر نکلا اور یکایک غنیم کے بائیں بازو پر نہایت جوش و خروش کے ساتھ ٹوٹ پڑا۔

یہ حملہ نہ تھا بلکہ سحر و افسوں تھا۔ جس کے اثر سے مرہٹوں کی دل
 با دل فوجیں کائی کی طرح پھٹ گئیں۔ کچھ ایسی ہی حل مچی۔ کہ بالکل
 حواس باختہ ہو گئے اور جیتی جتائی بازی چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ پھر تو
 دُرائیوں اور رُہیلوں نے وہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے کہ کشتوں کے
 پٹے اور مقتولوں کے انبار لگا دیے۔ میں میں کوس تک غنیم کا بھیا
 د بائے چلے گئے اور جہاں مرہٹہ سپاہی پایا۔ وہیں اُس کو ٹھکانے لگایا
 یہاں تک کہ اسیران جنگ پر بھی کچھ رحم نہ کیا جو ان کی تیغ بے دریغ
 سے بچ نکلا۔ اُس کو دہاقین نے سنگسار کیا۔ بھاؤ۔ بسواس اور دیگر چیدہ
 سردار مرہٹوں کے وہیں کھیت رہے۔ صرف امر اور سیندھیا زندہ بچے
 جب بقیۃ السیف اپنے ملک میں پہنچے ہیں۔ تو تمام دکن میں گھر گھر
 کُرام مچ گیا۔ کوئی قریہ اور قصبہ ایسا نہ تھا جہاں سے نالہ و فغاں کی صدا
 بلند نہ ہوئی ہو۔ ایسی خوفناک تباہی مرہٹوں پر کبھی نہ پڑی تھی اور بعد ازاں
 پہلی سی شان و شوکت اُن کو کبھی نصیب نہ ہوئی۔ مورخین دقیقہ سنج
 نے مرہٹوں کی ہزیمت کا سبب یہ قرار دیا ہے کہ وہ زور بازو
 و نیزوے جسمانی میں خلقت اپنے حریف کے بمقابل نہ تھے اس لئے
 شدائد جنگ و مصائب رزم کو زیادہ برداشت نہ کر سکے +
 (محمد امین)

مرزا رجب علی بیگ سرور

مرزا رجب علی بیگ نام۔ سرور تخلص۔ لکھنؤ کے رہنے والے۔ واجد علی شاہی دور کے بڑے مشہور شاعر تھے۔ یہ طرز انشا جو کہ سراسر تکلف تھی۔ اُس پر تکلف زمانہ میں چندے مقبول رہی۔ مگر اب تو بالکل مُردہ و افسردہ ہو گئی ہے۔

جاڑے کی شدت

ناگاہ ایک روز گندرمو کب حشمت و جلال۔ با فرو شوکت کمال۔
ایک صحرا سے باغ و بہار و درختِ لالہ زار میں ہوا۔ فضا سے صحرا
قابلِ تحریر کیفیتِ دشتِ گلشنِ آسلائیِ تقریر۔ بو باس ہر برگِ گل
کی رشکِ مشکِ اذفر۔ صفحہ بیاباں معنبر و معطر۔ چشموں کا پانی
صفائیں آبِ گوہر سے آبدار تر۔ ذائقہ میں بہ از شیر و شکر۔ چلنے کے
جاڑے کڑا کے کی سردی تھی۔ گویا کہ زمین سے آسمان تک
سج بھر دی تھی پرند اور چرند اپنے اپنے آشیاؤں اور کاشانوں
میں جھے ہوئے بیٹھے۔ بھوک اور پیاس کے صدمے اٹھاتے
تھے۔ دھوپ کھانے باہر نہ آتے تھے۔ قصد سے تھر تھراتے
تھے سردی سے سب کا جی جلتا تھا۔ دمِ تقریر ہر شخص کے مُنہ سے
دھواں دھار دھواں نکلتا تھا۔ آواز کسی کی کان تک کسی کے
کُم جاتی تھی۔ منہ سے بات باہر آئی اور جم جاتی تھی۔ مارِ سیاہ اوس چاٹنے
باہر نہ آتا تھا۔ سردی کے باعث دُم دبا کے بانہی میں بھاگ جاتا تھا۔

زمانے کے کاروبار میں خلل تھا۔ ہر ایک دست در بغل تھا۔ اشک شمع
 انجمن لگن تک گرتے گرتے اولا تھا۔ پروانوں نے پھرتے پھرتے ٹٹولا
 تھا۔ شعلہ کانپتا تھا۔ فانوس کے کھات میں منہ ڈھانپتا تھا۔ شمع کا جسم
 برف تھا۔ پگھلنے کا کیا حرف تھا۔ ہر سنگ کے سینہ میں آگ تھی۔
 گواہ شرعی سر رہا تھا۔ لیکن سردی کو بھی یہ لاگ تھی اور جاڑے
 کا ایسا اثر تھا کہ سلیں کی سلیں جھپی پڑی تھیں۔ فولاد سے زیادہ کڑی
 تھیں۔ تنور فلک چارم کی چھاتی سرد تھی۔ ٹخن میں یہ برودت تھی
 کہ کشمیر گرد تھی۔ لہجوں نے بٹیر پڑی۔ لوے لولوں کے ہاتھ آئے
 نگرے ہرن باندھ لائے۔ سرزمین ہند میں مردے نہ جلتے تھے
 زندوں کے ہاتھ پاؤں بگھلتے تھے۔ آتش رخسار گل خنم نے بجھائی تھی۔
 باغ میں بھی جاڑے کی دُہائی تھی۔ اوس برگ و بار کی صنعت پروردگار
 کی دکھائی تھی۔ مرقع کاری ایک بخت نظر آتی تھی۔ دانہ ہاے
 اشک خنم خواہ بڑے یاریزے تھے۔ ہر شجر کے پتے اور شاخ
 میں الماس اور موتیوں کے آدینے تھے۔ عذار لالہ حُمرار شک
 زعفران تھا۔ طلائی درختوں کی ٹہنیاں۔ کہربائی پتے۔ بہار میں رنگ
 خزاں تھا۔ اس سردی کا کہیں ٹھکانا تھا۔ خام نہ خانہ کا خس خانہ تھا۔
 آگ پر لوگ جی نثار کرتے تھے۔ زردشت کا طریقہ اختیار کرتے
 تھے۔ آفتاب عازم برج محل تھا۔ آتش پرستوں کا عمل تھا۔
 زیت سمندر کے عنوان تھی۔ آگ میں خلقت کی جان تھی۔ جاڑے

میں ہر ایک المست تھا۔ عالم اللہ کا آتش پرست تھا۔ جاڑے سے اُس
 دشت میں ایسا پالا پڑا تمام اہل لشکر کو تپ لرزہ کا عالم تھا۔ بانے تر چھ
 اٹھنے جاتے تھے۔ دُھال تلو اور کھڑکھڑانے کے عوض دانت کڑکڑاتے
 تھے پیچھے۔ چھان۔ پتھر کلے لاکھی سے بیکا۔ ہو گئے تھے چانپ سے
 پتھر آگ نہ دیتے تھے۔ اور توڑے دائرہ کا یہ حال تھا بوجھ کندھا توڑے
 دینا تھا۔ قدم اٹھانا محال تھا۔ توڑا ہر ایک گل تھا۔ توڑنے کی جگہ شور بلبل
 تھا۔ ہوش لوگوں کے کانپتے تھے۔ کینچوے کی مٹی کو الاؤ سمجھ پھونکتے پھونکتے
 بانپتے تھے۔ ملائم لوگوں کے حواس جم گئے تھے۔ جگنو کو چنگاری کے
 دھوکے اٹھانے کو ختم گئے تھے۔ سردی بسکے کا۔ فرما تھی۔ ایک کو
 دوسرے کی تمنا تھی۔ یہاں تک جاڑے کا زور شور عالمگیر ہوا تھا کہ کرہ
 نازد ہر یہ ہوا تھا۔

(سرور لکھنوی)

میرامن دہلوی

میرامن ولی کے رہنے والے تھے۔ بتلاش معاش چندے عظیم آبا میں قیام کیا وہاں سے چل کر کلکتہ پہنچے۔ جان گلکرسٹ کے حضور میں، بانی ہوئی۔ صاحب موصوف کی فرمائش سے سلسلہ عین قصہ چاروروش کو فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا اُن کی نثر اُس زمانہ کے روزمرہ اردو اور محاورات دہلی کا نہایت فصیح و صیح نمونہ ہے +

قصہ

یہ کمترین بادشاہ زادہ عجم کا ہے۔ میرے ولی نعمت و ہاں کے بادشاہ تھے اور سوائے میرے کوئی فرزند نہ رکھتے تھے۔ جوانی کے عالم میں مصاحبوں کے ساتھ چوڑ گنجفہ بشر بنجہ۔ تمشہ نزد کھیل کر تا یا سوار ہو کر سیر و شکار میں مشغول رہتا۔ ایک دن کا یہ ماجرا ہے کہ سواری تیار کروا کر اور سب یاروں آشناؤں کو لیکر میدان کی طرف نکلا۔ بازہ بہری۔ جزہ۔ باشہ سُرخاب اور تیتروں پر اڑاتا ہوا دوڑ نکل گیا۔ عجب طرح کا ایک قطعہ بہار کا نظر آیا۔ کہ جدھر نگاہ جاتی تو سوں تک بنرے اور پھولوں سے زمین لال نظر آتی تھی۔ یہ سماں دیکھ کر گھوڑوں کی باگیں ڈال دیں اور قدم قدم سیر کرتے ہوئے چلے۔ ناگاہ اُس صحرائیں دیکھا۔ کہ ایک کالا ہرن۔ اُس پر زربفت کی جھول اور بھنور کلی مُرتع کی۔ اور گھنگرو سونے کے زرد دوزی پٹے میں ٹکے ہوئے گلے میں پڑے

خاطر جمع سے اُس میدان میں۔ کہ جہاں انسان کا دخل نہیں اور پرندہ پر نہیں مارتا۔ چرتا پھرتا ہے۔ ہمارے گھوڑوں کے سُم کی آہٹ پا کر چکنا ہوا سر اٹھا کر دیکھا اور آہستہ آہستہ چلائے مجھے اُس کے دیکھنے سے یہ شوق ہوا۔ کہ رفیقوں سے کہا۔ تم ہمیں کھڑے رہو۔ میں اسے جلتا پکڑوں گا خبردار! تم قدم آگے نہ بڑھائیو اور میرے پیچھے نہ آئیو۔ اور گھوڑا میری رانوں سے ایسا پزندھا۔ کہ بار بار ہرنوں کے اوپر دوڑا کر۔ اُنکی کرچھالوں کو پھلا کر ہاتھوں سے پکڑ پکڑ لیتے تھے۔ اُس کے عقب دوڑا یا۔ وہ دیکھ کر پھلانگیں بھرنے لگا اور ہوا ہوا۔ گھوڑا بھی باؤ سے باتیں کرتا تھا۔ لیکن اُسکی گرد کو نہ پہنچا۔ وہ رہا پسینہ پسینہ ہو گیا اور میری بھی جیبہ مارے پیاس کے چٹھنے لگی۔ پر ہرگز کچھ پس نہ چلا۔ شام ہونے لگی اور میں کیا جانوں! کہاں سے کہاں نکل آیا؟ ناچار ہو کر اُس کو بھلاوا دیا اور ترکش میں سے تیز نکال کر اور قربان سے کمان بٹھال کر چلے میں جوڑ کشش کان تک لاکر ان کو اُس کی تاک "اللہ اکبر" کہہ کر مارا بارے پہلا ہی تیر اُس کے پاؤں میں ترازو ہوا۔ تب لنگڑا ہوا پہاڑ کے دامن کی سمت چلا۔ فقیر بھی گھوڑے پر سے اتر پا پایا وہ اُس کے پیچھے لگا۔ اُسی کوہ کا ارادہ کیا اور اُس کا ساتھ دیا۔ کئی اُتار چڑھاؤ کے بعد ایک گنبد نظر آیا جب پاس پہنچا ایک باغیہ اور ایک چشمہ دیکھا۔ وہ ہرن تو نظروں سے چھلا وہ ہو گیا۔ میں نہایت تھکا تھا۔ ہاتھ پاؤں دھوئے لگا ایک بارگی آواز دُونے کی اُس بُج کے اندر سے میرے کان میں

آئی جیسے کوئی کتا ہے۔ اے بچے! جس نے تجھے تیرا رامیری آہ کا تیر
اُس کے کلیجے میں لگیو۔ وہ اپنی جوانی سے پھل نہ پاوے اور خدا اُس کو
میرا سا دکھیا بناوے۔ میں یسین کروماں گیا۔ تو دکھا۔ کہ ایک بزرگ
ریش سفید اچھی پوشاک پہنے ایک مسند پر بیٹھا ہے اور بہن آگے لیٹا ہے
اُس کی جانب سے یہ تیر کھینچتا ہے اور بدعا دیتا ہے میں نے سلام کیا
اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ کہ حضرت سلامت! یہ تقصیر نادانستہ اس غلام سے ہوئی
خدا کے واسطے معاف کرو۔ بولا کہ ”بے زبان کو تو نے ستایا ہے۔ اگر انجان
تجھ سے یہ حرکت ہوئی۔ تو اللہ معاف کرے گا۔“ میں پاس جا بیٹھا۔ اور تیر
نکالنے میں شریک ہوا۔ بڑی دقت سے تیر کو نکالا اور زخم میں مرہم بھر کر
چھوڑ دیا۔ پھر ہاتھ دھو دھا کر اُس پر مرد نے حاضری جو اُس وقت
موجود تھی مجھے کھلائی۔ میں نے کھاپی کر ایک چار پائی پریمی تانی۔ بلنگی
کے سبب خوب پیٹ بھر کر کھوایا۔ اُس فیند میں آواز نوحہ و زاری کی
کان میں آئی آنکھیں ٹلکے جو دکھتا ہوں۔ تو نہ اُس مکان میں وہ بوڑھا ہے
نہ کوئی اور ہے۔ اکیلا میں ایک پلنگ پر لیٹا ہوں اور وہ دالان
خالی پڑا ہے +

(میر آئن دہلوی)

حسرت و ظلم

شہادت

از خواجہ الطاف حسین حالی

حُب وطن

اے فضاے زمیں کے گلزارو!
 اے لب جو کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا
 اے شبِ ماہتاب تاروں بھری!
 دہرنا پائدار کے دھوکو!
 تھے وطن میں مگر کچھ اور ہی چیز
 تم سے دل باغِ باغ تھا اپنا
 تم مرے دردِ دل کے درماں تھے
 تم سے پاتا تھا دلِ شکیبائی
 جو ادا تھی وہ جی بُھاتی تھی
 دھوئی جاتی تھیں کھفتیں ساری

اے سپہرِ بریں کے ستارو!
 اے پہاڑوں کی دلفریب فضا
 اے عنادل کے نغمہ سحری!
 اے نسیمِ بہار کے جھوکو!
 تم ہر اک حال میں ہو یوں تو عزیز
 جب وطن میں ہمارا تھا رونا
 تم مری دل لگی کے ساماں تھے
 تم سے کٹتا تھا رنجِ تنہائی
 آن اک اک تمھاری بھاتی تھی
 کرتے تھے جب تم اپنی غمخواری

جب ہوا کھانے باغ جاتے تھے
 بیٹھ جاتے تھے جب کبھی لب آب
 کوہ و صحرا و آسمان وزمین
 پر چٹا جب سے اپنا ملک دِ یار
 نہ گلوں کی ادا خوش آتی ہے
 سیرِ گلشن ہے جی کا اک جنجال
 کوہ و صحرا سے تالپ دریا
 کیا ہوئے وہ دن اور وہ راتیں
 ہم ہی غربت میں ہو گئے کچھ آؤر
 گو دہی ہم ہیں اور وہی دُنیا
 اے وطن! اسے مرے بہت بریں
 رات اور دن کا وہ سماں نہ رہا
 تیری دُوری ہے مور و آلام
 کاٹے کھاتا ہے باغ بن تیرے
 میٹ گیا نقشِ کمرانی کا
 جو کہ رہتے ہیں تجھ سے دُور سدا
 ہو گیا یاں تو دو ہی دین میں حلال
 سچ بتا تو سبھی کو بھاتا ہے
 میں ہی کرتا ہوں تجھ پہ جان نثار

ہو کے خوش حال۔ گھٹیں آئے تھے
 دھوکے اٹھتے تھے دل کے داغ شباب
 سب مری دل لگی کی شکلیں تھیں
 جی ہوا تم سے خود بخود بیزار
 نہ صدا بلبلوں کی بھاتی ہے
 شبِ مناب جان کو ہے وبال
 جس طرف جائیں جی نہیں لگتا
 تم میں اگلی سی اب نہیں باتیں
 یا تمھارے ہی کچھ بدل گئے طور
 پر نہیں ہم کو لطف دُنیا کا
 کیا ہوئے تیرے آسمان و زمین!
 وہ زمیں اور وہ آسمان نہ رہا
 تیرے چھٹنے سے چھٹ گیا آرام
 نکل ہیں نظروں میں داغ بن تیرے
 تجھ سے تھا لطف زندگی کا
 اُن کو کیا ہو گا زندگی کا مزا
 تجھ بن ایک ایک پل ہے اک اک سال
 یا کہ مجھ سے ہی تیرا ناتا ہے
 یا کہ سب تجھ پہ ہیں خدا اے یار!

کیا زمانے کو تو عزیز نہیں
 جن انسان کی حیات ہے تو
 ہے نباتات کو تو تجھ سے
 سب کو ہوتا ہے تجھ سے نشوونما
 تیری اک مُشتِ خاک کے بدلے
 جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا
 اے دل! اے بندہ وطن! ہتھیار
 اوشاطِ خودی کے متوالے!
 تام ہے کیا اسی کا حُبِ وطن!
 کبھی بچوں کا دھیان آتا ہے
 یا آتا ہے اپنا شہر کبھی
 نقش ہیں دل پہ کوچہ و بازار
 کیا وطن کی یہی محبت ہے
 اس میں انسان سے کم نہیں ہیں
 ٹکڑے ہوتے ہیں سنگِ غربت میں
 جا کے کابل میں آم کا پودا
 آکے کابل سے یاں بھی وانا
 مچھلی جب چھوٹتی ہے پانی سے
 آگ سے جب ہوا سمندر دو

اے وطن! تو تو ایسی چیز نہیں
 مرغ و ماہی کی کائنات ہے تو
 روکھ تجھ بن ہرے نہیں ہوتے
 سب کو بھاتی ہے تیری آب و ہوا
 تو نہ ہرگز۔ اگر بہشت ملے
 کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا
 خوابِ غفلت سے ہو ذرا بیدار
 گھر کی چوکھٹ کے چومنے والے
 جس کی تجھ کو لگی ہوئی ہے لگن
 بھی یاروں کا غم ستاتا ہے
 تو کبھی اہل شہر کی ہے لگی
 پھرتے آنکھوں میں ہیں درد و دیوار
 یہ بھی اُلفت میں کوئی اُلفت ہے
 اس سے خالی نہیں چرند و پرند
 سوکھ جاتے ہیں رُکھِ فرقت میں
 کبھی پروان چڑھ نہیں سکتا
 جو نہیں سکتے بارور زہار
 ہاتھ دھوتی ہے زندگانی سے
 اس کو جینے کا پھر نہیں مقدور

گھوڑے جب کھیت سے بچھڑتے ہیں
 گائے یا بھینس اونٹ یا بکری
 کہتے تھپ و طن اسی کو اگر
 بیٹھے بے فکر کیا ہو۔ ہموطنو!
 مرد ہو۔ تو کسی کے کام آؤ
 جب کوئی زندگی کا لطف اٹھاؤ
 بہنو جب کوئی عمدہ تم پو شاک
 کھانا کھاؤ۔ تو جی میں تم شراؤ
 کتنے بھائی تمہارے ہیں نادار
 لو کروں کی تمہارے جو ہے غذا
 جس پہ تم جوتیوں سے بھرتے ہو
 کھاؤ۔ تو پہلے لو خیر اُن کی
 بہنو۔ تو پہلے بھائیوں کو پنھاؤ
 ایک ڈالی کے سب ہیں برگ و ثمر
 سب کو ہے ایک اصل سے پیوند
 مقبلو! مدبروں کو یا د کرو
 جاگنے والو! غافلوں کو جگاؤ
 ہیں بے تم کو چشم و گوش اگر

جان کے اُن کی لالے پڑتے ہیں
 اپنے اپنے ٹھکانے خوش ہیں سبھی
 ہم سے حیواں نہیں ہیں کچھ کمتر
 اٹھو اہل وطن کے دوست بنو
 ورنہ کھاؤ۔ پیو چلے جاؤ
 دل کو دکھ بھائیوں کے یاد دلاؤ
 کرو دامن سے تاگریاں چاک
 ٹھنڈا پانی پیو تو اشک بہاؤ
 زندگی سے ہے جن کا دل سبزار
 اُن کو وہ خواب میں نہیں ملتا
 واں میسر نہیں وہ اوڑھنے کو
 جن پہ پتا ہے نیستی کی پڑی
 کہ ہے اترن تمہاری جن کا بناؤ
 ہے کوئی اُن میں خشک کوئی تر
 کوئی آزرده ہے کوئی ختر سند
 خوشدلو! غم زدوں کو شاد کرو
 پھرنے والے دُوبتوں کو تراؤ
 لوجہ لی جائے گور و کمر کی خیر

بزرگھارت

گرمی کی تپش بجھانے والی
 قدرت کے عجائبات کی کان
 وہ شاخ و درخت کی جوانی
 وہ سارے برس کی جان بہات
 آئی ہے بہت دعاؤں کے بعد
 برسات کا بج رہا ہے ڈھکا
 ہے ابر کی فوج آگے آگے
 ہیں رنگ برنگ کے رسالے
 ہے چرخ پہ چھاؤنی سی چھاتی
 جاتے ہیں معم پہ کوئی جانے
 توپوں کی ہے جب کہ بارش چلتی
 رنٹھ کا ہے زمین پر دڑیٹا
 بجلی ہے کبھی جو کوئٹہ جاتی
 گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
 کوسوں ہے جدھر نگاہ جاتی
 سورج نے نقاب لی ہے منہ پر
 باغوں نے کیا ہے غسلِ محبت

سردی کا پیام لانے والی
 عارف کے لئے کتابِ عرفان
 وہ مور و ملخ کی زندگانی
 وہ کون؟ خدا کی شان برسات
 اور سیکڑوں التجاؤں کے بعد
 اک شور ہے آسمان پہ برپا
 اور پیچھے ہیں دل کے دل ہوا کے
 گورے ہیں کہیں کہیں ہیں کالے
 اک آتی ہے فوج ایک جاتی
 ہمراہ ہیں لاکھوں توپ خانے
 چھاتی ہے زمین کی دھلش
 گرمی کا ڈبو دیا ہے بیڑا
 آنکھوں میں ہے روشنی ہی آتی
 جنت کی ہوائیں آ رہی ہیں
 قدرت ہے نظر خدا کی آتی
 اور دھوپ نے تہ کیا ہے بستر
 کھیتوں کو جلا ہے سبز خلعت

ہے چار طرف برس رہا نور
 اٹھکل سے ہیں راہ چلتے رہوار
 عالم ہے تمام ناچوردی
 دوٹھاسے بنے ہوئے ہیں اشجار
 ہے گونج رہا تمام جنگل
 اور مہر رہنکار تے ہیں ہر سو
 گویا کہ ہے دل میں بھیجی جاتی
 سنسار کو سر پہ ہیں اٹھاتے
 پانی میں مگر۔ کھار میں شیر
 قلعہ گنج ہیں اپنی کھال میں مست
 کلے ہیں خوشی کے ہرزباں پر

سبزہ سے ہے کوہ و دشت معمور
 بٹیا ہے نہ ہے مڑک نمودار
 ہے تنگ و تنگ کی ایک وردی
 بچوں سے پئے ہوئے ہیں کنسار
 پانی سے بھرے ہوئے ہیں بل بھل
 کرتے ہیں پیپے ”پیو پیو“
 کوئل کی ہے کوک جی بھاتی
 مینڈک ہیں جو بولنے پہ آتے
 سب خواہن کرم سے حق کے ہیں سیر
 زردا رہیں اپنے مال میں مست
 ابر آہے گھر کے آسمان پر

از مثنوی سحر البیان صنفہ تعمیر حسن و بلوی

میر غلام حسن نام۔ حق خلص۔ شرفاے دہلی تھے۔ فن شعر میں میر درد اور مرزا اسد اسے مشورہ کرتے تھے۔ ایام شباب میں دلی سے فیض آباد آئے۔ پھر کھنڈو۔ وہیں یہ مثنوی لکھی۔ جس سے بہتر اور دوس کوئی مثنوی نہیں ہوئی۔ بیان سادہ پر تاثیر اور محاورہ کی خوبیوں سے معمور۔ جس معاملہ کو بیان کیا ہے اس کی تصویر کھینچ دی ہے۔

تھکا جس کے سب سے کو اقل قلم
 کہا دو سرا کوئی شجہ سائنس
 ہوا حرف زن لیں کہ رب العلام

کہوں پہلے تو حیدر زداں رقم
 سر لوح پر رکھ بیاض جبین
 قلم پھر شہادت کی اٹھلی اٹھا

تیری ذات ہے وَحْدٌ کَلا شَرِیْکُ
 کہ ہے ذات تیری غَفُوْرُ الرَّحْمٰنِ
 تجھے سجدے کرتا جلوں سر کے بل
 قلم جو لکھے۔ اُس سے افز و دہے
 وہ ابرِ کرم ہے ہوا دایرِ خلق
 دے پرورش سب کی منظور ہے
 جو وہ مہرباں ہو۔ تو کُل مہرباں
 یہ سب اُس کے عالم ہیں ہژدہ ہزار
 اسی کلمے دوزخ۔ اُسی کی بہشت
 ہیں قبضہ میں اُس کے زمان و زمیں
 وہ کچھ شے نہیں۔ پہر اک شے میں ہے
 لیکن چمکتا ہے ہر رنگ میں
 تو سب کچھ وہی ہے۔ نہیں اور کچھ
 کیا خاک سے پاک اُس نے نہیں

نہیں کوئی تیرا نہ ہو گا شریک
 پرستش کے قابل ہے تو۔ اے کریم
 روحِ حمد میں تیری عَزَّ وَجَلَّ
 وہ الحق۔ کہ ایسا ہی معبود ہے
 تروتازہ ہے اُس سے گلزارِ خلق
 اگرچہ وہ بے فکری غیور ہے
 کسی سے برا دے نہ کچھ کام جاں
 نہاں سب میں اور سب میں ہے آشکار
 اُسی سے ہے کعبہ اُسی سے کنشت
 وہ ہے مالک الملک دنیا و دیں
 نہیں اُس سے خالی غرض کوئی شے
 نہ گوہر میں ہے وہ۔ نہ ہے سنگ میں
 تامل سے کیجے اگر غور کچھ
 دیا عقل و ادراک اُس نے نہیں

وصف سخن

کہ ہو جس سے مفتوح باپ سخن
 سخن ہی تو ہے۔ اور کیا بات ہے
 سخن سے ہے نام نکو یاں بلند
 سخن نام اُن کا رکھے برقرار

یلا مجھ کو ساقی شراب سخن
 سخن کی مجھے فکر دِن رات ہے
 سخن کے طلبگار ہیں عقلمند
 سخن کی کریں قدر مردانِ کار

<p>سخن سے وہی شخص رکھتے ہیں کام سخن سے سلف کی بھلائی رہی کہاں رستم و گیو و افراسیاب سخن کا جملہ یار دیتے رہے سخن کا سدا گرم بازار ہے رہے جب تلک داستان سخن</p>	<p>جنہیں چاہئے ساتھ نیکی کے نام زبانِ قلم سے بڑائی رہی سخن سے رہی یاد یہ نقلِ خواب جو اہر سدا مول لیتے رہے سخن بچ اُس کا خریدار ہے اکی! رہیں قدر داں سخن</p>
---	---

سواری کی تیاری

<p>پڑھی جب گرہ بارہویں سال کی کہا شہ نے بلوا نقیبوں کو شام سواری بھگت سے تیار ہو کریں شہر کو مل کے آئینہ بند رعیت کے خوش ہوں صغیر و کبیر یہ فرما محل میں گئے بادشاہ خوشی میں گئی جلد جو شب گذر عجب شب تھی وہ جوں سحر و سفید کہا شاہ نے اپنے فرزند کو ہوا جب کہ داخل وہ حمام میں تن نازیں نہ ہوا اُس کا کل نہادھو کے بھلا وہ گل اس طرح</p>	<p>کھلی گل جھڑی غم کے جنجال کی کہ ہوں ضح حاضر بھی خاص و عام ہتیا کریں جو کہ درکار ہو سواری کا ہو لطف جس سے دوچند کہ بچلے گا گل شہر میں بے نظیر نقیبوں نے سن حکم لی اپنی راہ ہوئی سامنے سے نمایاں سحر عجب روز تھا مثل روزِ امید کہ ”بابا! نہادھو کے تیار ہو“ عرق آگیا اُس کے اندام میں کہ جس طرح ڈوبے ہے شبیم میں گل کہ بلی سے بچلے ہے مہ جس طرح</p>
--	--

غرض شاہزادہ کو ہنلا ڈھلا
 بھل گھر سے جس دم ہوا وہ سوار
 زبیں تھا سوار سی کا باہر نجوم
 برابر برابر کھڑے تھے سوار
 وہ ماہی فراتب۔ وہ تختِ رواں
 وہ شمشایوں کی صدا خوش ثنا
 وہ آہستہ گھوڑوں پے تقابلی
 سوار اور پیادے۔ صغیر و کبیر
 ہوئے محکم سے شاہ کے پھر سوار
 سجے اور سجائے بھی خاص دعام
 غرض اس طرح سے سوار سی چلی
 رعیت کی کثرت۔ ہجوم سپاہ
 لگانے سے تا ضعیف و نحیف
 نظر جس کو آیا وہ ماہ تمام
 غرض شہر سے باہر اک سمت کو
 سوار سی کو پہنچا گئی فوجِ ادھر
 پھر رات تک پہنچے پوشاک وہ
 قضا را وہ شب تھی شب چارہ وہ
 نظارہ سے تھا اُس کے دل کو مود

دیا خلعتِ خسرو نہ پینھا
 کیے خوان گوہر کے اُس پر نثار
 ہوا حجب کہ ڈھکا پڑی سب میں دھوم
 ہزاروں ہی تھیں ہاتھیوں کی قطار
 وہ نوبت کہ دوٹھکا جیسے سماں
 شہانی وہ نوبت کی دھیمی صدا
 قدم با قدم۔ بالباس زری
 جلو میں تمامی اسیر و وریر
 چلے سب ترین سے باندھے قطار
 لباس زری میں ملبس تمام
 کہے تو۔ کہ یاد بہار سی چلی
 گذرتی تھی ٹک ٹک کے ہر جاگاہ
 تماشے کو نکلے وضع و شریف
 کیا اُس نے جھک جھک کے اُس کو سلام
 کوئی باغ تھاشہ کا اُس میں سے ہو
 گئے اپنی منزل پہ شمس و قمر
 رہا ساتھ سب کے طربناک وہ
 پڑا جلوہ بلیتا تھا ہر طرف
 عجب عالم نور کا تھا ظہور

عجیب اُلفت تھا سیرِ مَتّاب کا
کچھ آئی ہو اُس نہ کے جی میں ترنگ
ارادہ ہے کوٹھے پہ آرام کا
نہیں نیند میں تھا جو وہ ہو رہا
جہاں تک کہ چوکی کے ستے باریدار

کے تو۔ کہ دریا تھا سیلاب کا
کہا آج کوٹھے پہ سچے پلنگ
کہ بھایا ہے عالم لبِ بام کا
بچھونے پہ آتے ہی بس سو رہا
ہوا جو چلی سٹو گئے ایک پار

شہزادہ گم ہو گیا

گھلی آنکھ جو ایک کی داں کہیں
نہ ہے وہ پلنگ اور نہ وہ ماہر
نہ بن آئی کچھ اُن کو اس کے سوا
ہوا گم وہ یوسف۔ پڑی یہ جو دھوم
شب آدھی وہ جس طرح سوتے کٹی
عجب طرح کی شب تھی ہیماں وہ
سحر نے کیا خبِ گریبان چاک
اُٹھا شہر میں سب طرفِ شور و غل
غم و درد سے دل جو سب کا بھرا
وہ لبریز جو تھرکتی جا بجا
ہو احوال چشموں کا پاں تک تباہ
کہاں وہ کنوئیں اور کدھر آبشار!
جہاں رقص کرتے تھے طاؤسِ باغ

کہو دیکھا کہ وہ شاہزادہ نہیں
نہ وہ گل ہے اُس جا۔ نہ وہ اُس کی بُو
کہہ سکتے یہ احوال اب نہ سے جا
کیا خادمانِ محل نے ہجوم
رہی تھی جو باقی۔ شور و سٹو کٹی
قیامت کا دن تھا۔ نہ تھی رات وہ
اُڑانے لگے بل کے سب سر پہ خاک
کہ غائب ہوا اس چین سے وہ گل
ہوا باغِ بہار ادہ ماتم سہرا
سو آنکھوں کو وہ رہ گئی ڈبڈبایا
کیا رختِ پانی سے اپنا سیاہ
کوئی دل میں روئے کوئی ڈھار مار
لگے بولنے اُن مُنڈیروں پہ زلفِ

<p>ہوئے سب وہ جوں دیدہ نچوں چکاں سو وہ سب خزاں سے ہوئے نضحل نقطہ دل میں اک خار ہجر اں رہا کہ ہوتی ہے اب اُس کی حالت تباہ و لیکن خُدا اُن سے چار انہیں غرض اُس کے نزدیک کیا دور ہے بہر نوع رہنے لگے یک دگر و لیکن نہ پائی کچھ اُس کی خبر</p>	<p>منقش جہاں تھے وہ نگیں مکاں کافوں کی طرح کھل رہے تھے جودل نہ غنچہ نہ گل نے گلستاں رہا دزیروں نے دیکھا جو احوال شاہ اکھاگو خُدا اُن کو انہیں خُدا کی خُدا اُن تو معور ہے یہ کہہ اور شہ کو بٹھا تخت پر ٹٹا یا بہت باپ نے مال دزر</p>
---	--

شادی کا سماں

<p>چڑھایا بنے وہ بہ شب فروز نبی شاد دیا نے ہم ایک بار کولی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا سواروں کے گھوڑے بھڑنے لگے گم جنا وہ دھوسوں کا مانندِ غد پینگے خوشی سے غزل خواں ہوئے وہ آوازِ سرِ نا۔ وہ آوازِ بوق کہے تو کہ تنگی اوجھل پہاڑ کسی پر کنول۔ اور کسی پر درخت ستاروں کا چھٹنا پٹا خوں کا شور</p>	<p>بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز محل سے نکل جب ہوا وہ سوا کوئی دوڑ گھوڑوں کو لانے لگا سیر اور قبضے کھڑکنے لگے بکور سے وہ نوبت کے اور اُن کے بعد دورستہ جو روشن چراغاں ہوئے براتی ادم اور ادم جو جوق جوق وہ ابرک کی ٹٹی وہ مینے کے جھاڑ دورستہ برابر برابر وہ تخت اناروں کا دغنا بچپنے کا زور</p>
--	---

<p>ہر اک رنگ کی جس سے دہلی ہمار کہوں داں کے عالم کی کیا تجھ سے بات چڑھیں بٹیاں موم کی چار چار دھڑے بہر طرٹ جھاڑے تلوڑ کے بے ایک سے ایک سب پیش و پس برابر رفیقوں کا آ بیٹھنا پلاسب کو شربت دیے پاندان سواری کی ہونے لگی پھر تو دھوم دہ ڈھن کی رخصت - دہ رونے کا وقت وہ ماں باپ کا اور روتا جدا کہ جوں جہنم سے اشک ہو موج خیز کہ جانا ہے اک دن یوہیں جان کو وہ شادی کا لیتے ہیں غم سے مزا</p>	<p>وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار جب آئی وہ ڈھن کے گھر پر بات بلوریں دھڑے شمع داں بے شمار نئے رنگ کے اور نئے طور کے تماشائیوں کی یہ کثرت - کہ بس وہ دو لہا کا سند پہ جا بیٹھنا ہوا جب نکاح اور بٹے ہار پان وہ سب ہو چکے جب کہ رسم موم سحر کا وہ ہونا - وہ ٹونے کا وقت وہ ڈھن کا رو رو کے ہونا جہا نکلتے وہ جانا محل سے جہیز یہاں موت ہے اہل عرفان کو وہ جو دردمندی سے ہیں آشنا</p>
---	--

شہزادہ کا ملنا

<p>گڑغائب ہوا تھا سو آ یا وہ گل کیا گم آنکھوں نے وہ ہیں آپ کو کہا ہاے! ہم کو نہیں اعتبار کہ بیٹھا تھا رادھی ہے! وہی! چلا پھر تو روتا ہوا منگے پاؤں</p>	<p>پڑا شہر میں یک بیک پھر یہ گل خیر یہ ہوئی جب کہ ماں باپ کو لگے رونے آپس میں تار و تزار کہا سب نے صاحب! چلو تو سہی اکر رہنا جب کہ بیٹے کا ناؤں</p>
--	---

جو ہیں اپنے کعبہ کو دیکھا رواں
 گر پاتوں پر کہہ کے یہ باپ کے
 سنی بہ صد احو ہیں اُس ماہ کی
 ملے پھر تو آپس میں وہ خوب سے
 ہوئے شاد و خوشم صغیر و کبیر
 مے عیش سے سب کو مستی ہوئی
 در آمد ہو اگھر میں سرور رواں
 کہ استے میں آگے نظر جو بڑی
 نبی چشم سے آنسوؤں کی قطار
 وہاں خوب بیٹے کے لگ کر گلے
 ہو اور بیٹے کو مچھاتی لگا
 ہوئی جان اور جی سے اُن رخسار
 وہ آنکھیں جو اندھی تھیں روشن ہوئی
 نہ بس باپ ماں کو تھی سہرہ کی چاہ
 بنا اُن کی تقدیر کا جو بناؤ
 ہو اشہر پر فضل پروردگار
 وہی بلبلیں اور وہی بوستان

چلا سر کے بل بے نظیر جہاں
 وہ خُدا نے دکھائے قدم آپ کے
 تو اُس غم رسیدہ نے اک آہ کی
 کہ یوسفؑ ملے جیسے یعقوبؑ سے
 چلے نے کے نذریں امیر و وزیر
 نئے سر سے آباد بستی ہوئی
 لیے ساتھ اپنے وہ غنچہ دہاں
 تو دیکھا کہ ہے راہ میں ماں کھڑی
 گر اماں کے پاتوں پر بے اختیار
 یہ روئی کہ آنسو کے تالے چلے
 وہ دونوں کی دو ہاتھ سے لی بلا
 پیایا پی اُن دونوں پر دار و دار
 زمینیں جو تھیں خشک گلشن ہوئیں
 دوبارہ اُنھوں نے کیا اُس کا سیاہ
 نکالے اُنھوں نے یہ سب دل کے چا
 وہی شاہزادہ - وہی شہریار
 شگفتہ گل و جمع دوستان

از شبنوی گلزارِ نسیم

پتہ دیا شکرِ متخلص بہ نسیم سرکارِ اودھ کی فوج میں منشی تھے۔ اور فنِ سخن میں خواجہ آتش کے شاگرد۔ قصہ گلِ بکادلی جو پہلے نثر میں تھا۔ اُس کو نظم کر کے گلزارِ نسیم نام رکھا تنبیہ و استعارہ اور صنائعِ لفظی و معنوی سے بیان کو آراستہ اور قصہ کو مختصر کیا ہے میر تقی میر کی شبنوی کے بعد یہ ہی شبنوی ہے جو مقبول عام ہوئی۔

۱	<p>نمرہ ہے قلم کا حمدِ باری حمدِ حق و مدحتِ ہمیشہ یعنی کہ مطیعِ پنجتن ہے کرتا ہے زباں کی پیش دستی</p>	<p>ہر شاخ میں ہے شکوفہ کاری کرتا ہے یہ دوزباں سے کسیر پانچ انگلیوں میں یہ حرفِ زک ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی</p>
۲	<p>یوں نقل ہے خامہ کی زبانی سلطانِ زمین الملوکِ دیجاہ دشمنِ کش و شہر یار تھا وہ دانا۔ عاقل۔ ذکی۔ خردمند پس ماندہ کا پیش خمیہ آیا یا لاتاج الملوک رکھ نام چٹلی سانگہ رکھ کے پالا مانندِ نظرِ رواں ہوا وہ</p>	<p>رودادِ زبانِ پاستانی یورب میں ایک تھا شہنشاہ لشکرِ کش و ماجدار تھا وہ خالق نے دیے تھے چار فرزند نقشہ ایک اُور نے جمایا تھا افسرِ خسرواں وہ کلفام بردست سے نہ دایہ نے نکالا جب نامِ خدا جو اں ہوا وہ</p>

<p>نظر سارہ کیا پسر کو ناگاہ کی نورِ بصر سے چشم پوشی چشمک سے نہ بھائیوں کو بھائی اُس ماہ کو شہر سے نکالا خارج ہوا تو یہ دیدہ کور لایا کوئی جا کے سرمہ طور بنیاد ہوا وہ دیدہ کور مختار ہے جس طرح بنا ہے</p>	<p>آتا تھا شکار گاہ سے شاہ مہربان نہ ہوئی خموشی وہ آنکھ جو شہ نے رونمائی ہر چند کہ بادشہ نے ٹالا گھر گھر یہی ذکر تھا یہی شور آیا کوئی لے کے نسخہ نور تقدیر سے چل سکا نہ کچھ زور ہوتا ہے وہی خدا جو چاہے</p>	
<p>عسی کی تھیں اُس نے آنکھیں دیکھیں سلطان سے ملا کہا کہ شاہا با بلکوں سے اُسی پہ مار چنگل ہے نہر گیا اُسی چمن کی لوگوں کو شگوفہ ہاتھ آیا رخصت کیے شہ نے چار و تاجا شکر۔ اسباب۔ خیمے بزرگاہ</p>	<p>تھا اک کمال پیر دیریں وہ مرد خدا بہت کراہا ٹپے باغ بکاؤلی میں اک گل خورشید میں یہ ضیا کرن کی اُس نے تو گل ارم بتایا شہزادے ہوئے وہ چاروں تیار شاہانہ چلے وہ لے کے ہمراہ</p>	
<p>یعنی تلج الملوک تاشاد دیکھا تو وہ لشکر آہا تھا</p>	<p>وہ باد یہ گرد خاتہ برباد میدان میں خاک ہوا ہا تھا</p>	

<p>جاتے ہو کہ ہر صورت سیل " جاتی ہے ارم کو فوج شاہی دیدار پسر سے ہو گیا کوہ مطلوب گل بکاؤ لی ہے گلشن کی ہوا سمانی اُس کو قسمت پے چلا وہ تیک اختر صحرا صحرا کوہ در کوہ گل کا نہ تیا لگا کسی سے</p>	<p>پوچھا تم لوگ خیل کے خیل بولا لشکر کا اک سپاہی سلطان زمین الملوک شہ زور منظور علاج روشنی ہے گل کی جو خبر سنانی اُس کو ہمرہ کسی لشکر کی کے ہو کر یک چند پھرا کیا وہ ابنوہ بگبیل ہوے سب ہزار جی سے</p>
--	---

۵

<p>یعنی تاج الملوک دل زار اللہ کے نام پر چلا وہ صحرا سے عدم بھی تھا جہاں گرد عنقا تھا نام جا نور کا نقش کھنڈ پاتھے ریگ باہی یار ریگ زواں تھا یادہ زہر د اک دیو تھا پاسبان بلا کا ناقول سے رہا تھا پھانک کر خاک شیرینی دیو کو چڑھائی لے آدمی زاد وہاں وہاں!</p>	<p>وہ دامنِ دشت شوق کا خاں درویش تھا بندہ خدا وہ اک جنگل میں جاڑا جہاں گرد سایہ کو پتا نہ تھا شجر کا مرغان ہوا تھے ہوش راہی وہ دشت کہ جس میں بڑنگ دود ڈانڈا تھا ارم کے بادشاہ کا بھوکا کئی دن کا تھا نہ ناپاک حلوے کی پکا کر اک کر مھائی کہنے لگا۔ کیا مر ہے دلخواہ!</p>
---	---

چیز اچھی کھلائی تو نے مجھ کو
 بولا وہ کہ پہلے قول دیجئے
 گلزارِ ارم کی ہے مجھے دھن
 خورشید کے ہم نظر نہیں ہے
 رہ جا! مرا بھائی ایک ہے اور
 حال اُس نے کہا کہ قول ہمارا
 مشاق ارم کی سیر کا ہے
 حتمال نام دیوئی ایک
 خط اُس کو لکھا بایں عبارت
 ”پیارا ہے مرا یہ آدمی زاد
 انسان ہے چاہے کچھ جو سازش
 باپ اُس کا ہے اندھے چن سے جھول
 ”دل داغ اس کا براے گل ہے
 خط لے کے بشر کو لے اڑا دیو
 بھائی کا جو خط بہن نے پایا
 دیوؤں سے کہا کہ چو ہے بچاؤ
 سن حاجتِ نقب بہرِ گلشت
 جب ہر تر زمیں سما یا
 کھٹکا جو نگا ہبانوں کا تھا

کیا اس کے عوض میں دوس میں تجھ کو
 پھر جو میں کہہ اس قبول کیجئے
 بولا وہ اسے بش! دکا بن
 اندیشہ کا داں گزندہ نہیں ہے
 شاید کچھ اُس سے بن پڑے طور
 ہے میریہ فوجواں ہمارا
 کو شمش کرو گام خیر کا ہے
 چھوٹی بہن اُس کی تھی بڑی ٹیک
 ”اے خواہر مہرباں سلامت! رکھو اسے
 جس طرح مر ہی یا“
 ہمان ہے کیجیو نوازش
 مطلوب بکاؤنی کا ہے بھول
 نرگس کے لئے ہوا سے گل ہے
 بہو بچا حتمال پاس بے رویو
 نیچے ہوئے کو گلے لگایا
 تا باغ ارم سرنگ بہو بچاؤ
 کترا چوہوں نے دامنِ دشت
 اُس نقب کی رہ وہ آدم آ یا
 دھڑکا یہی دل کا کہہ ہا تھا

<p>خوشہ کوئی تاکتہ ہو وے خوابیدہ بزرگ سبزہ سب تھے پہونچا لب حوض سے نہ جنگل بچو لاندہ جا مہ میں سما یا چوری سے چلا چراغ برکت اس نقب کی آستیں سے نکلا اس نقب کی رخنہ بنیاں کیں</p>	<p>گوشہ میں کوئی لگانہ ہو وے گو بلغ کے پاسبان غضب تھے پانی کے جو ٹیکوں میں تھا گل پوشاک اتار اتر کے لایا گل لے کے بڑھا ایاغ برکت گل ہاتھ میں مثل دست بیضا گل لے کے جب آہلا وہ گلچیں</p>
۶	
<p>اور غنیمت صبح کھلکھلایا یعنی وہ بکا ولی گل نام آٹھی نگت سی فرش گل سے پڑ آب وہ چشم حوض پانی کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے جھجھلائی کہ کون دے گیا جل ہے ہے ابھے خارے کیا کون قہو کے دو گل اڑا نہیں ہے بیگانہ تھا سبزہ کے سوا کون اوپر کا تھا کون آنے والا جس گھر میں ہو گل چراغ ہو جائے</p>	<p>گلچیں نے وہ پھول جب اڑایا وہ سبزہ باغ خواب آرام جاگی مرغ سحر کے گل سے متحہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی دیکھا تو وہ گل ہوا ہوا ہے گھبرائی کہ ہیں! کدھر گیا گل ہے ہے ہمارا پھول لے گیا کون ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے انہوں میں سے پھول لے گیا کون شبنم کے ہوا چراغ آنے والا جس کف میں وہ گل ہو داغ ہو جائے</p>

<p>آنکھوں سے عزیز گل میرا تھا گلچیں کا جو ہا ہے! ہاتھ لٹا اوخار! پڑا نہ تیرا چنگل او باوصبا - ہوا نہ بتلا بلبیل! تو چپک اگر خبر ہے؟ لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کھرام جو نخل تھا سوج میں کھڑا تھا رنگ اس کا غرض لگا دینے گل کا سا ہو بھرا گریباں دکھلا کے کہا سمن پر سی کو تھی بسکہ غبار سے بھری وہ ہر باغ میں پھولتی پھری وہ جس تختہ میں مثل باد جاتی بے وقت کسی کو کچھ ملا ہے</p>	<p>پتلی وہی چشم حوض کا تھا غنچہ کے بھی تنہ سے کچھ نہ پھوٹا مشکیں کس لیں نہ تو نے سنبل؟ خوشبو ہی سنگھا پتا نہ بتلا؟ گل! تو ہی ہمک نگھا کہ مر ہے؟ تھی سبزہ سے راست موزا نام جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا گل برگ سے کف لگی وہ لٹنے سبزہ کا ساتا رتا راماں اب چین کہاں! بکاؤ لی کو آندھی سی اٹھی - ہوا ہوئی وہ ہر شاخ میں جھولتی پھری وہ اُس رنگ کے گل کی بو نہ پاتی پتا کیس حکم بن ہلا ہے؟</p>
---	--

(نسیم کسنوی)

از شہنوی میر تقی

میر تقی امام میر خلیس شرفائے اکبر آباد سے تھے۔ ذہنی بیونج کران کی شاعری نے شہرت پائی
شعراے ماضی و حال نے ان کو غزل گوئی کا امام مانا ہے۔ فنو یاں بھی اچھی ہیں۔ مگر قصیدہ مسکا
کلام انکا نہایت صاف و شستہ اور دُر اثر ہے۔ آخر عمر میں لکھنؤ چلے گئے تھے۔ شوہر بس کے
ہو کر ۱۸۵۷ء میں رہی ملک بھا ہوئے۔ درد۔ سودا۔ معشوق۔ انشا۔ اور مہجرات
کے مہر تھے۔

چل رہے خامہ۔ بسم اللہ اب
ثبت جمدہ میری زبانی
سر تا پا اندوہ و الم تھا
رخسٹ اس سے ہو گئے بالکل
بیتابی نے طاقت پائی
ایک گھڑی آرام نہ پایا
اور پلک خود ننا بہ گویا
شبیون لب پر یاس نظریں
مر گئے کتنے۔ سر کو دھن کر
داغوں سے خوں کے قاسم گلین
بدر میں تھا ایک پتچا بھوڑا
تسکیں بے آرامی ہی سے
ناخن سے منہ سارا نوچا

ضبط کروں میں کب تک آہ اب
کر تک۔ دل کار ایز نہانی
یعنی۔ میر اک خستہ غم تھا
تاب و توں و تکیب و تحمل
سینہ نگاری سامنے آئی
خواب و خورش کا نام نہ آیا
سوز سے چھاتی تا بہ گویا
دل میں تمنا۔ داغ جگر میں
ناملے شب کو اس کے سن کر
روے وجہیں یہ خراش ناخن
غم نے تو دل میں کیا ہی چھوڑا
کام رہا نا کامی ہی سے
دستہ غم سے سینہ کو چا

دل آماجگہ غمتا کی نے طاقت نے یارا اُس کو رنگ اڑے چہرہ کا ہر دم رنگ مشکستہ - بیکہ فسرودہ دیدہ تر کے دریا قائل ہر دم ہو ہر سمت کو جاری خاک بسر آشفۃ سری سے وادی پر جب اپنے آوے سر پر اُس کے سنگ ہمیشہ آفسرد کرے وہ غریاں پامالی میں مثل جاوہ اُس کے جو پامال ہوئے سب جس نے دکھا اُس کو یکدم	اور نفسِ اِگ تیرِ خاکی ضعفِ دلی نے مارا اُس کو تھا گویا گل آخروں سم کنے کو زندہ - لیکن مردہ ساحل خشک لبی کے سائل تو بناری سے سیل بہاری شورِ قیامت نوچہ گری سے صحرا صحرا خاک اڑا دے جی پر عرصہ تنگ ہمیشہ بید ساکانے ہوئے پریشاں نقش قدم سا خاک افادہ خارِ بیا باں لالی ہوئے سب اُس نے کہا یہ بھول کے سب غم
---	---

چندے یہ نا شادر ہے گا
پر محنت تک یاد رہے گا

(میر)

W. M. Rashed
1967

غزلیات

جہاں استاد۔ فصیح الملک۔ نواب مرزا خاں۔ دآرغ دہلوی

<p>۱</p> <p>پڑی آنکھ جس کوہ پر طور نکلا دبا کر جو دیکھا۔ تو نا سٹور نکلا اگر ایک نکلا تو منصور نکلا نہ یہ دُور نکلا۔ نہ وہ دُور نکلا مگر وہ تو عالم میں مشہور نکلا</p>	<p>۱</p> <p>جہاں تیرے جلوہ سے معمور نکلا یہ سمجھے تھے ہم ایک چڑکا ہے دل پر نہ نکلا کوئی بات کا اپنی پورا وجود و عدم دونوں گھریاں نکلا بھیختے تھے ہم دآرغ گمنام ہوگا</p>
<p>۲</p> <p>کچھ ٹھکانا نظر نہیں آتا اٹھ کے جاتا نظر نہیں آتا ہم نے مانا نظر نہیں آتا یاں ٹھکانا نظر نہیں آتا وہ خزا نا نظر نہیں آتا</p>	<p>۲</p> <p>وہ زمانہ نظر نہیں آتا دل نے اُس بزم میں بٹھا تو دیا سب سے شاق جلوہ دیدار لے چلو مجھ کو رہروان عدم دل پر آرزو نکال دآرغ</p>
<p>۳</p> <p>دنیا میں محش کا ہمارے نہ کھلا بند ہر غم میں گرفتار ہوں ہر فکر میں پابند</p>	<p>۳</p> <p>دل میں ہے غم و رنج و الم حرص و ہوا بند موقوف نہیں دام و نفس پر ہی ایسی</p>

<p>اے حضرت دل! جلیے۔ میرا بھی خد ہے ہم ٹکتے ہی سینہ سے نکل پڑتے ہیں آنسو کہتے تھے ہم۔ اے دل غ! وہ کو چہ خطر نک</p>	<p>بے آپ کے رہنے کا تیس کام مرا بند بارش کی علامت ہے جو ہوتی ہے بھابھ چھپ چھپ کے مگر آپ کا جانا نہ ہوا بند</p>
<p>حضرت دل! آپ ہیں جس دھیان میں گر فرشتہ دش ہوا کوئی۔ تو کیا؟ جس نے دل کھویا۔ اسی کو کچھ ملا کس نے لینے کا کیا وعدہ کہ داغ</p>	<p>مر گئے لاکھوں اسی ارمان میں آدمیت چاہیئے انسان میں فائدہ دیکھا۔ اسی نقصان میں آج ہو تم اور ہی سامان میں</p>
<p>خدا دے۔ تو دے اپنا غم ہر کسی کو نہ کرنا صحا! ایسی دیوانی باتیں محبت میں جس جاگئے ٹٹ گئے ہم بہت چھڑ کر ہم کو بھپتا بیٹے گا</p>	<p>کرے پر نہ مائل کسی پر کسی کو یہ کیا؟ کھینچ مارا جو پتھر کسی کو لیا دل کسی نے۔ دیا سر کسی کو ساتے نہیں بندہ پرور کسی کو</p>
<p>نہیں ہوتی بندہ سے طاعت زیادہ وہ تشریف لاتے ہی بولے کہ رخصت اکھی! زمانہ کو کیا ہو گیا ہے؟ عدم سے سب آتے ہیں یاں چادوں کو مری بندگی سے مرے جرم افزوں</p>	<p>بس اب خانہ آباد۔ دولت زیادہ! نہیں ہم کو ملنے کی فرصت زیادہ! محبت تو کم ہے عداوت زیادہ! نہیں ہوتی منظور رخصت زیادہ! ترے قمر سے تیری رحمت زیادہ!</p>

۶	<p>چمپا کھلی - گلاب کھلا - موتیا کھلی گلشن میں گر بہا بہت خوش نما کھلی دیوارِ قید خانہ مگر یارِ ہا کھلی تو شکلِ گل نہ بٹلِ خویشِ نوا کھلی مانندِ غنچہِ قبر بھی بعدِ فنا کھلی</p>	<p>دل کی کلی نہ تجھ سے کبھی اسے صبا کھلی ہم تو اسیرِ دِ اُم ہیں شاید! ہم کو کیا؟ نالوں سے شق ہوئے جگر یا سبان کا رونا نصیب میں ہو تو مہنسا ہو کس طرح؟ داعِ شکستہ دل کا ذرا دیکھنا اثر</p>
۸	<p>جن سے خلشِ تجی دل میں وہ کانٹے نکل گئے ہمراہ کوہ طور کے موسیٰ نہ جل گئے لاکھوں ہماری آنکھ سے جلے نکل گئے فرقت میں رفتہ رفتہ سب جابِ ٹل گئے کیا جانے! آج داعِ کدھر کو نکل گئے</p>	<p>سب حسرتوں کا یاس نے کھٹکا مٹا دیا سچ ہے پرائی آگ میں بڑتا نہیں کوئی اب کیا ہے! اگر کسی سے ملاتے نہیں نظر مرنے کے ساتھ کوئی بھی مرنے نہیں کبھی احبابِ ڈھونڈتے ہیں پریشاں ہیں فریق</p>
۹	<p>زندگی ہے اگر - تو کیا غم ہے! جانتا ہوں - مزاجِ برہم ہے مہربانی تری مہمّہ منہ ہے باد سے اب تو سلوکِ باہم ہے</p>	<p>غم اٹھانے کے واسطے دم ہے ✓ کہتے ہو کچھ کہو - کہوں کیا خاک آبِ جہاں مہرباں ہوا - تو کیا! سُننے ہیں داعِ اکل وہ آئے تھے</p>
۱۰	<p>چڑھی ہے یہ گندھی اتر جائے گی</p>	<p>طبیعت کوئی دین میں بھر جائے گی</p>

<p>میں گی دم مرگ تک خواہیں نہ تھی یہ خبر ہم کو۔ اپنی بہار نہ چھوڑی گی دامن کبھی شت خاک دیا دل تو اسے داغ اندیشہ کیا</p>	<p>یہ نیت کوئی آج بھر جائے گی ادھر آئے گی اور ادھر جائے گی صبا ہم سے اڑ کر کہہ کر جائے گی گذرنی جو ہوگی۔ گذر جائے گی</p>
<p>امیر الشعراء منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی</p>	
<p>ریاض دہریں پوچھو نہ میری بربادی خدا کی راہ میں دینا ہے گھر کا بھر لینا قدم حضور کے آئے مرے نصیب کھلے جب آئی جوش پہ میرے کریم کی رحمت سچے مہینوں ہی تنگ غریب بٹل نے اٹھائے صدے پہ صدے۔ تو آبرو پائی</p>	<p>برنگ پورا ادھر آیا ادھر روانہ ہوا ادھر دیا کہ ادھر داخل خزانہ ہوا جو آپ قصر سیماں غریب خانہ ہوا گرا جو آنکھ سے آنسو۔ ڈر بیگا نہ ہوا مگر نصیب نہ دور روز آتشیا نہ ہوا امیر۔ ٹوٹ کے دل گوہر بیگا نہ ہوا</p>
<p>وہ تو سنا ہی نہیں میں داد خواہی کیا کروں چہ گدا کو نہ نہ تکلیف حکومت اسے ہوں مجھ کو ساحل تک خدا پہنچائے گا لے ناخدا</p>	<p>کس کے آگے جاکے سر پڑوں۔ اتنی کیا کروں چار دن کی زندگی میں بادشاہی کیا کروں اپنی کشتی کی بیاں تجھ سے تباہی کیا کروں</p>
<p>وہ مے اعمال روز و شب سے واقف ہے امیر پیش خالق ادا ہے بے گناہی کیا کروں؟</p>	

	۳	
<p>وہ مہرباں نہ ہو۔ تو کوئی مہرباں نہ ہو اتنا بھی کوئی مائل خواب گراں نہ ہو حاصل جیسے سے کیا؟ جزا آستان نہ ہو کوئی سوار تو سن عمر رواں نہ ہو</p>		<p>انسان عزیزِ خاطر اہل جاں نہ ہو پیری میں بھی گیا نہ تغافل ہزارِ حیف آنکھوں سے فائدہ؟ جو نہ دیدارِ نصیب جانے اگر کہ چا و عدم میں گرائے گا</p>
	(۴)	
<p>درد بول اٹھا۔ تڑپنا چاہیئے آدمی کو صبر تھوڑا چاہیئے کچھ مزہ اس کا بھی چکھا چاہیئے ضبطِ اعصاب رتھا چاہیئے</p>		<p>دل نے جب بوجھ لگے کیا چاہیئے؟ حرص و نیا کا بہت تھتہ ہے طول ترک لذت بھی نہیں لذت سے کم ہے مزاج اس کا بہت نازکِ آئیر</p>
	(۵)	
<p>سختی پہ بھی نرم گفتگو کی اب تک تو نظر کہیں نہ چو کی راہیں تو یہی ہیں جستجو کی جڑ کٹ گئی فخلِ آرزو کی آنکھوں نے ہزارِ شست و شو کی</p>		<p>کی دل شکنی نہ تند خو کی کی جس پہ نگاہ۔ تجھ کو دیکھا جزدیر و حرم کہاں میں جاؤں دل ہی نہ رہا امید کیسی گفت نہ رہی آئیر! دل سے</p>
	(۶)	
<p>تھوڑی سی بھی آہ و بہت ہے مجھ کو اسے دردِ با تو بہت ہے</p>		<p>موتی کی طرح جو ہو خدا داد جاتے ہیں جو صبر و ہوش جائیں</p>

یہ درد کی گفتگو بہت ہے
تیرے دُم کو ٹھو بہت ہے
اس وقت میں آبرو بہت ہے

ما نندِ کلیم بڑھ نہ اسے دل!
اے نشترِ غم! ہو لاکھ تن خشک
کیا غم ہے آئینہ! اگر نہیں مال

از مؤلف

۱

کام اگر جب مدعا نہ ہوا
سب جتا یا کیے نیا ز قدیم
کیا کھلے؟ جو کبھی نہ تھا نہ مال
سخت فتنہ جہان میں اٹھتا
تو نہ ہو۔ یہ تو ہو نہیں سکتا

تیرا چاہا ہوا بُرا نہ ہوا
وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا
کیوں ملے؟ جو کبھی جلد نہ ہوا
کوئی تجھ سا ترے سوا نہ ہوا
اور کوئی ہوا۔ ہوا۔ نہ ہوا

۲

جو بھلے بُرے کی انگلی نہ مرا شعاع ہوتا
میں کبھی کا مریجی رہتا نہ غم فراق ہوتا
کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا
ہے اس انجمن میں کیاں عدم وجود میرا

نہ جزاے خیر پاتا۔ نہ گناہ گار ہوتا
اگر اپنی زندگی پر سمجھے اختیار ہوتا
کہ جو تم سے کوئی کرتا۔ تمہیں ناگوار ہوتا
کہ جو میں یہاں نہ ہوتا۔ یہی کارِ بار ہوتا

۳

کبھی تفسیر جس نے کی ہی نہیں
دوستی اور کسی غرض کے لئے!

ہم سے پوچھو تو آدمی ہی نہیں
وہ تجارت ہے۔ دوستی ہی نہیں

<p>نہیں چکھی۔ وہ مُشتقی ہی نہیں غم سے بدتر ہے۔ وہ خوشی ہی نہیں</p>	<p>جامِ وحدت کی دُردی بھی جس نے جس خوشی کو نہ ہو قیام و دوام</p>	
	(۶۷)	
<p>محالات کا سرفلم دیکھتے ہیں وہ خوبیِ مصنوع کم دیکھتے ہیں آنکھیں دمبدم تازہ دیکھتے ہیں وہ منزل کو زیر قدم دیکھتے ہیں</p>	<p>جہاں تیغِ مہمتِ علم دیکھتے ہیں کمالاتِ صانعِ بچن کی نظر ہے نہیں مبتلا جو تن آسانوں میں اڑتے ہیں جو رخشِ مہمت کو سرچ</p>	
	(۶۵)	
<p>یاں تاب کیے شادوری کی کیا شان ہے بندہ پروری کی وُسعت ہے چرخِ چنبیری کی سوکھی مٹنی ہری پھری کی ہیہات! جو تو نے داہی کی ہم نے بھی نگاہِ سرسری کی</p>	<p>ہے وصفِ ترا محیطِ اعظم دی زندگی اور اُس کا ساماں کیا آنکھ کو قتل دیا کہ جس میں کی بعدِ خنداں بہار پیدا کیا بات ہے! اگر کیا ترختم ہر شکل میں تھا وہی نمودار</p>	
	(۶۶)	
<p>گل نہیں۔ تو گل کی نگاہ ہی سی آپ کی سب پر حکومت ہی سی یا دایا دمِ فراغت ہی سی کلکِ صنعت گر کی صنعت ہی سی</p>	<p>راہ و رسمِ خطِ کتابت ہی سی بیدماغی بندہ پرور۔ اس قدر بسکہ فکرِ اعیشِ نصفِ اعیش ہے حسنِ صورت کا نہ کھا اصلا فریب!</p>	

کچھ نہ کرنا بھی مگر اک کام ہے	اگر نہیں صحبت۔ تو عزت ہی ہے
(۷)	
<p>ممکن ہے کہ ٹل جائے جبل اپنے مقر سے ہو جان کی جو نکھوں بھی اگر راہ طلب میں خلوت میں بھی لاتے نہیں عاقل اسے نصیر ہم کرتے ہیں عادت کی غلامانہ اطاعت پتے کی طرح جو کوئی محکوم ہوا ہو ڈھانی ہے قیامت یہی خوشنور جہاں یہ</p>	<p>لیکن کبھی تبدیل جبلت نہیں ہوتی پست اس سے اولوالعزم کی ہمت نہیں ہوتی جو بات کہ شائستہ جلوہ نہیں ہوتی اصلاح پذیر اس لئے عادت نہیں ہوتی اُس شخص کی دنیا میں کبھی پت نہیں ہوتی کچھ غم نہیں ہوتا جو جھٹ نہیں ہوتی</p>
(۸)	
<p>تو جان بیچ کر بھی جو فضل و ہنر ملے جب چشمِ آرزو ٹوٹ گئی سب غلش مٹی ممکن نہیں بغیر قناعت فراغِ بال چن کو نہیں ہے درد و دوا میں کچھ امتیاز</p>	<p>جس سے ملے جہاں سے ملے جس قدر ملے اب سنگریزہ ہاتھ لگے یا گھر سے بہر چند تو وہ تو وہ تھے سیم و زر سے قسمت سے ان گنوں کے ہمیں جاہ گری سے</p>
(۹)	
<p>غیر توکل نہیں چارائے حرص و طمع نے تو ڈوبیا ہی تھا جو وہ کرے اس کو منرا دیا ہے فرصت اوقات ہے بس منتہی آہ یا نہیں مخلصت افتاء راز</p>	<p>اپنے ہی دم کا ہے سہارا مجھے صبر و قناعت نے ابھارا مجھے چوں و چرا کا نہیں یا رانے مجھے یہ نہیں ملنے کی دو بارانے مجھے قصہ تو معلوم ہے سارا مجھے</p>

سراج الدین محمد - بہادر شاہ - ظفر

سراج الدین محمد نام تھا۔ بہادر شاہ لقب۔ ظفر تخلص آخری جانشین شادان مغلیہ فیض ابراہیم ذوق کے شاکر تھے۔ ان کا کلام نہایت سادہ و سلیس اور روزمرہ اردو کا عمدہ نمونہ ہے۔

(۱)

کسی نے اُس کو سمجھایا تو ہوتا
نہ بھیجا تو نے کچھ کرا ایک پر چہ
نہ بولا۔ ہم نے کھڑکایا بہت در
جو کچھ ہوتا سو ہوتا۔ تو نے تقدیر
دل اُس کی زلف میں الجھا ہے کب سے
کوئی یاں تک اسے لایا تو ہوتا
ہمارے دل کو سپر چایا تو ہوتا
ذرا دریاں کو کھڑکایا تو ہوتا
وہاں تک مجھ کو پہونچایا تو ہوتا
ظفر اک روز سلجھایا تو ہوتا

(۲)

ہر بات میں تو ایک ہی ہے لاکھ پہ بھاری
ہے جامہ تکلف کا پسندیدہ احمق
جز تارکِ دنیا ہو ہوس سے دسکدوش
صرفہ نہیں کاغذ کا۔ مگر بھیجتے ہیں وہ
دنیا میں ظفر ہے گرا نبار جہالت
اگر بات کو اپنی نہ کرے طول سے ہلکا
ہوگا نہ گدھا یہ کبھی اس مجھول سے ہلکا
یہ بوجھ نہ دنیا کے ہو مشغول سے ہلکا
خط ڈاک میں اندیشہ حصول سے ہلکا
کب ہوتا ہے وہ مردم معقول سے ہلکا

(۳)

اگے پڑا نہ ہی کیا اس بزم میں جل ٹھن گیا
جائے اس دپہ اور دھونی راکر بیٹھے
نام جن کا رکھا کچھ اس کا گن باقی رہا
شمع بھی یاں روگنی شعلہ بھی یاں مہن گیا
جو گیا دل سوختہ واں باندھ کر پھن گیا
ورنہ جہاں سے گیا ساتھ اس کے اس کا گن گیا

<p>ایک بچہ جس کا نہ اُڑ کر سہل گیا سبز ہو سکتا نہیں وہ جو کہ دانہ گھن گیا کان میں جس دم خطرِ خالق کا امر گن گیا</p>	<p>میں صبا! وہ طائرِ طاقت ہر گلشن میں واسطے بے مغز کے کیا خاک ہو نشو و نما جاگ اٹھا خوابِ عدم سے یک بیکساں لہجہ</p>
(۴)	
<p>اس بے مزگی میں کوئی جیتا ہے تو کیا بیچ! ازہرِ نشانِ سلیکِ نشانِ بعدِ بیچ! آنے کا نہیں کام ترے اس کے سوا بیچ!</p>	<p>غم خانہ دنیا میں ہے جیسے کا مزا بیچ! کیا کیا عمل و قصرتا ہے تو انگہ ایمان کو نہ دے ہاتھ سے غافل لکھ میں گ</p>
(۵)	
<p>جو کہ مٹ جائے کوشیے ہیں فنا کی راہ پر آشنا وہ ہے کہ جو ہوا آشنا کی راہ پر استقامت کی ہے تسلیمِ رضا کی راہ پر</p>	<p>چاہتے ہیں کب نشان اپنا نشانِ نقشِ بیا دل سے ہو کیونکر طریق آشنا کی نہیں خلاف ہے صلہ المستقیم اس کے لئے جس نے طفر</p>
(۶)	
<p>دنیا ہے چل چلاؤ کا رستہ سنبھل کے چل مانندِ جوشِ نعم نہ زیادہ ابل کے چل اس پر سپند دار نہ اتنا اچھل کے چل سایہ سے بچ کے اہلِ فریب و غفل کے چل اور آپ ہی وہ کہتا ہے بچے کو گل کے چل کہتا ہے کون بچکوانہ چل چل سنبھل کے چل تو کہد و اُس کو طور یہ تو اس غزل کے چل</p>	<p>اتقانہ اپنے جامہ سے باہر نکل کے چل کم ظرف! بے غرور! ذرا اپنا ظرف و کچھ فرصت ہے اک صدگی یہاں ہر دل کھتا یہ غول و ش ہیں۔ ان کو سمجھ تو نہ رہنا انسان کو گل کا پتلا بنا ہے اُس نے آپ چہرہ نکھین بھی تو دی ہیں۔ کہ رکھ دیکھ تو ہم جو امتحان طبع کرے اپنا اسے طفر</p>

	۷	
<p>بھلوں کو ہیں زیبا بھلائی کی باتیں کر دے مٹھ پہ ہم سے صفائی کی باتیں تو کیوں کرتے وہ کج ادائی کی باتیں اسیر واکرہ دیکھ رہا نی کی باتیں جہاں دیکھوں میں وہاں بُرائی کی باتیں</p>		<p>نہیں تم کو لازم بُرائی کی باتیں غضب ہے کہ دل میں تو رکھو گدازت اگر سیدھے ہوتے مرے بخت و ازل نفیس میں ہے کیا فائدہ شور و غل سے ظفر! کیا زمانہ بڑا آ گیا ہے</p>
	(۸)	
<p>تیرے آنے کی ہیں پہنچی خبر اُڑتی ہوئی پھرتی پروانہ کی خاکستر اُڑتی ہوئی برقِ تھرا جائے رنج و بیکار اُڑتی ہوئی سُرخِ رنگِ حنا جلاں قید اُڑتی ہوئی خاکِ ہی گھٹی کدورت میں ظفر اُڑتی ہوئی</p>		<p>گردِ جوائے شہسوار! آئی نظر اُڑتی ہوئی دلِ جلوں کی مہتی قسمت میں بربادی تو کیوں وہ تکار اندازے جب ہاتھ میں اپنے تنگ بے ثباتی کیا کمول ہستی کی؟ دیکھی ہی نہیں ہے جو کچھ رونقِ صفائی میں ہر دلی مردہ لیا</p>
	(۹)	
<p>ہاں! اگر جلیبِ رُخسار کی جان کو ہم رو گئے ساتھ اپنے تجا کو بھی دونوں جہاں سے گھو گئے جب وہاں سے ایک خط آیا یہاں سے دو گئے</p>		<p>کیا کیا اگر ترمی محفل میں ہم نے شمعِ سلا حضرتِ دل تو گئے رہ کر گئے اور اک ستم شوقِ انعام سے دونوں ہی محبت میں رہا</p>
<p>اے ظفر! جاؤ دل دیوانہ کو ڈھونڈھو کہیں ہے خدا جانے کہاں؟ مدت ہوئی اُس کو گئے</p>		

ملک الشعرا شیخ ابراہیم ذوق

کلام نہایت عام پسند۔ محاورات و ضرب الامثال خوب باندھتے ہیں۔ مفصل حال دیکھو صفحہ ۷، حصہ ۱، نشر

	۱	
<p>اگر پایا۔ تو کھوج اپنا نہ پایا فرشتہ اس کا ہم پایا نہ پایا تو ہم نے یاں نہ کچھ کھویا۔ نہ پایا کہیں جس کا نشاں پایا نہ پایا عبارت رواہ بھی عقدا نہ پایا کبھی کج قسم کو سیدھا نہ پایا بھل جاتے۔ مگر رستانہ پایا کبھی ہم نے تجھے تنہا نہ پایا دہن پایا۔ لب گو یا نہ پایا عرض۔ خالی دل شیدا نہ پایا کہیں ایسا نہ پائے گا نہ پایا</p>		<p>اُسے ہم نے بہت ڈھونڈھا نہ پایا جس انسان کو سبک دنیا نہ پایا مقتدر ہی پہ گر سود و زیاں ہے سرایع عمر رفتہ ہو۔ تو کیونکر روگم گشتگی میں ہم نے اپنا ربا بیڑا مثال نیش کش قدم احاطے سے فلک کے ہم تو کب کے جہاں دیکھا۔ کسی کے ساتھ دیکھا کے کیا ہاے زخم دل ہمدرد کبھی تُو اور کبھی تیرا ہر غم نظیر اس کا کہاں عالم میں! اے ذوق</p>
	(۲)	
<p>اے فلک! اگر تجھے اونچا نہ سنا دیتا آسماں آکھ کے تل میں چڑکھائی دیتا خاک ساری سے نہ جا روپ صفائی دیتا گر حریصوں کو خدا ساری خللی دیتا</p>		<p>نالہ اس زور سے کیوں میرا دہائی دیتا دیکھ چھوٹوں کو ہے اند بڑائی دیتا کون گھر آئندہ کے جانا؟ اگر وہ گھر میں متحہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے متحہ</p>

دیکھ۔ اگر دیکھنا ہے ذوقِ اکوہِ شہریا		دیدہ روزن دل سے ہے دکھائی دیتا
	(۳)	
بے نصیب اس کے ہیں گردیدار سے اٹھ چکا وہ ناتواں - جو رہ گیا اپنے دامن کو بچا کر جانیو ناکسوں سے کیا رکھیں وارِ سنگل		ہی دو آنکھوں کو نظر کے تار سے دب کے تیرے سایہ دیوار سے برق! میرے دادی پُر خار سے آنکھ کب دامن صبا کا خار سے
	(۴)	
وہ خلق سے پرتلے ہیں - جن فیضِ سماں ہیں قریبا دستم کش ہے وہ شمشیر کشیدہ اشکوں میں بے جاتے ہیں ہم سوے دیار لے ذوق! کسی ہدمِ دیرینہ کا ملنا		ہے شلخِ فردا میں گل پہلے نثر سے جس کا نہ رُکے دارِ فلک کی بجی پر سے مقصود رو کعبہ ہے دریا کے سفر سے بہتر ہے ملاقاتِ میحاً و نصیر سے
	(۵)	
کیا غرض لکھ خدا کی ہیں ہوں دولتِ ملے ہے جو شیشہ ساعت وہ مگدّر دونوں لحڑھس کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ شہوت نہیں جڑ شمع جاوڑ مرے بالینِ مزار سہ ستم کا کبھی شکوہ - نہ کریم کی خواہش کیا تماشہ ہے اک شہلِ مہ نوا پنا فروغ کبھی افسوس ہے آتا - کبھی رونا آتا		آن کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے کبھی بل بھی گئے دو دل جو قدرت والے تنگس ہی رہتے ہیں فیئاس فراغت والے نہیں جڑ کثرت پر واندہ زیارت والے دیکھ تو اب ہم بھی ہیں کیا صلہ قناعت والے جانتے اپنی حقارت کو میں شہرت والے دل بیا رنگے ہیں دو مہی عیادت والے

ناز ہے گل کو زناکت پہ جن میں آذوق	اُس نے دیکھے ہی نہیں ناز و زناکت والے
(۶)	(۶)
نہیں ثبات بلندی عز و شرف کے لئے نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے جو پاس مہر و محبت کیس یہاں بکتا اگر امید نہ ہمسایہ ہو۔ تو خاندان یا س و بال دوش ہے اس ناتواں کو سر تکین بنایا آدمی کو ذوق ایک جزو ضعیف	کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسمان کے لئے عصل ہے پیر کو اور سیف ہو جواں کے لئے تو مول لیتے ہم اک اپنے مہربان کے لئے بہشت ہے ہمیں آرام جاوداں کے لئے لگا رکھا ہے ترے خنجر و رنماں کے لئے اور اس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے
(۷)	(۷)
ایسا نہ کہ آتے ہی آتے جواب خط لے شمع تیری عمر طبعی ہے ایک رات بے فیض گر ہے چشمہ آب بقا تو کیا! اپشتہ سے سکیمے مشیوہ مردانگی کوئی اس جبرِ مذوق! یہ انسان کا حال ہے	قاصد! جو اب زندگی مستعار دے مہنہ کر گزرا یا اُسے ویر گزاردے ماگلو۔ تو ایک قطرہ نہ آئینہ واردے جب قصہ خوں کو آئے تو پہلے پکڑے کیا جانے کیا کرے! جو خدا اختیار دے
(۸)	(۸)
لائی حیات۔ آئے قضاے پچلی۔ چلے ہم سہمی۔ اس بساط پہ کم ہوگا بد قمار بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے ہو عمر خضر بھی۔ تو جو معلوم وقت مرگ	اپنی خوشی نہ لئے۔ نہ اپنی خوشی چلے جو چال ہم چلے۔ وہ نہایت بُری چلے پر کیا کریں! جو کام نہ بے دل لگی چلے ہم کیا رہے یہاں! ابھی آئے۔ ابھی چلے

حکیم مومن خاں - مومن

مومن خاں نام مومن تخلص۔ وطن دہلی۔ طبابت پیشہ آبائی۔ ۱۲۱۹ھ ہجری میں پیدا ہوئے۔ ۱۲۶۶ھ میں رحلت کی۔ نہایت ذکی و ذہین آدمی تھے۔ اُن کی روش خاص معاملہ بندی ہے کہیں میز و قد کی سی سادہ بیانی۔ کہیں باریکی۔ ذوق و غالب کے ہم عصر تھے۔

(۱)

<p>وعدہ و صلت سے ہودل شاد کیا! کچھ قفس میں ان دنوں گلتا ہے جی ہیں اسیر اُس کے۔ جو ہے اپنا اسیر نالہ اک دم میں اڑا اڈالے دھوئیں جب مجھے رنج دل آزاری نہ ہو کیا کر دل امتد! سب میں بے اثر ان نصیبوں پر کیا اختر فتناس جگہ جنت ہے چلیے بے ہراس</p>	<p>تم سے دشمن کی "مبارکباد" کیا! استیاں اپنا ہوا بر باد کیا! ہم نہ مجھے صید کیا! صیتا دیکھا! چرخ کیا اور چرخ کی بنیاد کیا! بے وفا! پھر حاصل بیدا دیکھا! ولولہ کیا! نالہ کیا! فساد کیا! آسمان بھی ہے ستم ایجا دیکھا! لب پہ مومن "ہر حق بادا" دیکھا!</p>
--	---

(۲)

<p>کیا رم نہ کرو گے۔ اگر انہرام نہ ہوگا ہاں جوش تیش با جھیر چلی جائے کہ پرتو ناکامی! متید پر صبر کرنے کو کیا آئے</p>	<p>الزام سے حاصل مجز الزام نہ ہوگا جھڑ جائیگے فرسودہ اگر دام نہ ہوگا ہر بات میں کہتے ہو کہ یہ کام نہ ہوگا</p>
--	---

وہ مشق رہی اور نہ وہ شوق ہے مومن
 کیا شمع کہیں گے۔ اگر انہام نہ ہوگا

(۳)	<p>سرخ راحت فرا نہیں ہوتا دل کسی کام کا نہیں ہوتا گرچہ اک سہ عا نہیں ہوتا میں کسی سے خفا نہیں ہوتا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا سو تو تھارے سے نہیں ہوتا صنم آخر خدا نہیں ہوتا</p>	<p>اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا اس نے کیا جانے کیا کیا لگتا آہ! طول اہل ہے روز افزوں نار سائی سے دم رے کوڑ کے تم مرے پاس ہوتے ہو گویا چارہ دل سواے صبر نہیں کیوں سنے عرض مومن مضطر</p>
(۴)	<p>اس جو رہ چپ کرتے ہیں تجھ سے گواپنا پھر شخ و برہمن میں ہے کیوں غلام اپنا سو آپ ہی پامال کیا قافلہ اپنا راضی ہیں۔ گواہ ابھی کرین فیصلہ اپنا تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا</p>	<p>قابو میں نہیں ہے دل کم حوصلہ اپنا لبیک حرم ہمیں۔ نہ نافرین کلیسا تھے دشت میں ہمراہ مرے آبلہ چند اس حال کو پہنچے تھے قید سے کہ اب ہم انصاف کے خواہاں ہیں نہیں طالبِ مذہم</p>
(۵)	<p>کہیں سایہ میرا پڑا صاحب جو کیا۔ سو بھلا کیا صاحب خیر ہے، میں نے کیا کہا صاحب کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب</p>	<p>تم بھی رہنے لگے خفا صاحب ستم۔ آزار۔ ظلم۔ جو رجفا کیوں اُنکھتے ہو جنبش لب سے کیوں لگے دینے خواہ آزادی</p>

کیجئے بس خدا خد صاحب !	نام عشق تھاں نہ لو۔ مومن !
(۶)	
<p>پر کیا کریں اک ہو گئے نا جارجی سے ہم انصاف کیجئے۔ پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم لو بندگی یا کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم اور دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم مومن نہ ہوں جو رہا رکھیں بدعتی سے ہم</p>	<p>ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملینگے کسی سے ہم مجھ سے نہ ہو تو تم۔ اسے کیا کہتے ہیں بھلا ! صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا ! کیا گل کھلے گا ! دیکھیے ! ہر فصل گل تو دو لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں</p>
(۷)	
<p>کیا علم و حوس سے ترے شہدا کے اٹھے لیکے اٹھے بھی۔ تو اک نقش بٹھا کے اٹھے جس جگہ بیٹھ گئے آگ لگا کے اٹھے ضعف کے ہاتھ سے کب قتل و غارت گئے خوب احوال دل زار سنا کے اٹھے</p>	<p>سینہ کوئی سے زین ساری ہلا کے اٹھے گو کہ ہم صفحہ بہتی پہ تھے اک حرف غلط آف رمی گرمی محبت کہ ترے سوختہ جان میں دکھاتا تھیں تاثیر۔ گر ہاتھ مرے شعر مومن کے پڑے بیٹھے کے اُس کے آگے</p>
(۸)	
<p>تلافی کی بھی ظالم نے۔ تو کیا کی خبر لا دے کوئی تحت الشری کی کہ تو نے کس توقع پر وفا کی !</p>	<p>اگر غفلت سے باز آیا جفا کی فلک کے ہاتھ سے میں چا چھوڑوں۔ مگر جنا سے تھک گئے۔ تو بھی نہ پوچھا</p>
<p>کہا اس شوخ سے "مرتا ہے مومن" کہا "میں کیا کروں مرضی خدا کی"</p>	

نواب مصطفیٰ خاں شیفۃ

مصطفیٰ خاں نام۔ شیفۃ تخلص۔ جاگیر آباد ضلع بلند شہر کے جاگیردار اور عائد دہلی سے تھے۔ ان کی ذات ستودہ صفات امارت۔ فقاہ اور علم و فضل کی جامع تھی۔ ریختہ میں حکیم مومن خاں مومن سے مشورہ کرتے تھے۔ کلام نہایت متین و سنجیدہ۔ فارسی کا رنگ غالب ہے۔ پوری میں اعلیٰ مقام پر تھے۔

	(۱)	
<p>پے شک ادھر بھی آئیگا جھونکا نیم کا نیرنگ و عشوہ کا م ہے دیو رحیم کا والبتہ سبب ہے کرم کب کریم کا قوار کا جنساں ہو زبانیہ جیم کا تیس امتی ہوں ناز و جنال کے قسیم کا</p>		<p>اے جان بقیرا ذرا صبر چاہیے جس کی شرت صاف نہو آدمی نہیں طاعت اگر نہیں تو نہ ہو۔ یاس کس لئے جس وقت تیرے لطف کے دیا کو جوش لگے اے شیفۃ اعذاب جہنم سے کیا مجھے؟</p>
	(۲)	
<p>فسانہ ہے مشہور سیاب کا غلط شوق ہے جنس نایاب کا یہ ہے وقت آن کے شکر خواب کا رہا ذکر گل اور ہر باب کا جاں شغل ہو سیر متاب کا جفا میں نہیں دخل سباب کا کہ اغماض شیدہ ہے حباب کا</p>		<p>دل زار کا ماجرا کیا کہوں! کماں پھر وہ نایاب! پایا جسے نہ کچھ فعل۔ لے خوشنوا بان صبح! محبت نہ ہرگز جتائی گئی وہاں تیرہ روزوں کی پروا کسے میں بچرم رہتا ہوں خائف سکواں نہ کرنا خطا پر نظر شیفۃ</p>

(۳۱)	<p>اہل طریق کی جی روش سب سے الگ ہنگام عہد کام میں لائے وہ ایسے لفظ یہ بات تو غلط ہے۔ کہ دیوان شفیقتہ لیکن مبالغہ تو ہے البتہ! اس میں کم</p>	<p>جتنا زیادہ شغل۔ زیادہ فراغ بال جن کو ہے معنی متعدد پر اشتغال ہے نسخہ معارف و مجموعہ کمال ہاں! ذکر خدو خال۔ اگر ہے تخیال خال</p>
(۳۲)	<p>اگر ام سے ہے کون جان خراب میں سب اس میں جو اور وہ سب سے غلو معنی کی فکر چاہیے صورت سے کیا حصول ذات و صفات میں بھی ربط جانے قطع نظر جو نقش و نگار جہاں سے ہو مرنے کے بعد بھی کہیں شاید پتا لگے وہ قطرہ ہوں۔ کہ موجہ دریا میں گم ہوا اس صوت جاں نوا کا ثانی نہیں بنا لے آفت زمانہ! ترے دور میں شکیب میاں شہوہ۔ شوخ طبیعت۔ لڑاں دراز تکلیف شفیقتہ ہوئی تم کو مگر حضورا</p>	<p>گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سُر آب میں جو آفتاب و روشنی آفتاب میں دیکھو وہ آنکھ سے۔ جو نہ دیکھا ہو خواب میں کھویا ہے ہم نے آپ کو عہد شباب میں وہ سایہ ہوں۔ کہ جو ہوا آفتاب میں کیا ڈھونڈتے ہو! ربط و عود و رباب میں بیل کو باغ میں ہے۔ نہ ماہی کو آب میں گنہگار ہو اسے۔ پر نہیں عاجز جواب میں اس وقت اتفاق سے دہریہ تاب میں</p>
(۵)	<p>خاک در اس شخص کی اکیر ہے</p>	<p>جو کہ ہوا محو تجلی ذات</p>

<p>فرض کیا۔ آہ میں تاثیر ہے خامہ! مدد کر۔ دم تحریر ہے پاؤں میں فولاد کی زنجیر ہے شیقتہ! کچھ اپنی ہی تقصیر ہے</p>	<p>کھیل ہے کچھ یہ؟ کہ دکھا دوں نہیں نقطہ کے نہ کھینے کا لکھوں کیا گلہ؟ کیا کہوں! احباب کی آہن دلی ہم سے وہ ناحق جو نفا ہو گئے</p>
	(۶)
<p>ستم کو اگر وہ بھلا جانتا ہے اگر آشنا۔ آشنا جانتا ہے جو محفل کو خلوت سرا جانتا ہے کچھ آئینِ اہل صفا جانتا ہے کہ وہ آپ ہم سے سوا جانتا ہے</p>	<p>سنگ مر کے سے بُرا مانا کیوں! جو بیگانہ جانتے تھے خلق۔ کیا غم! لے گئے رنجِ خلوت کی کیا ہے ضرورت! بہر صورت آئینہ بھی مُغتنم ہے ہمیں شیقتہ کی نصیحت سے چل!</p>
	(۷)
<p>کہ کس کے وعدہ پر اتنا ہے انتظار مجھے نہ کوئی دوست ملیگا نہ کوئی یار مجھے نولے دلکش مرغِ خانِ شاخسار مجھے جیسے غرور ہو۔ آئے کرے شکار مجھے جان میں نہ ملا کوئی رازدار مجھے کچھ اشتہار نہیں ہو۔ کچھ اشتہار مجھے خراب تو نے کیا۔ جلوہ بہار مجھے کہ ان کی بزم میں ہو دخلِ اختیار مجھے</p>	<p>ابھی کہوں۔ تو کریں لوگ شرمسار مجھے یہی گمان ہی رشک ہے اگر۔ تو کبھی تقص میں کرتی ہے تحریکِ بالِ جنبانی ہزار دام سے بھلا ہوں ایک جنبش میں رہے سرِ ابرکتِ مودہ دل ہی میں۔ افسوس! جفا کو ترک کرو تم۔ وفا کو میں چھوڑوں جو شورشیں نہ بچاتا۔ اسیر کیوں ہوتا! بڑے فسادِ اٹھیں شیقتہ! خدا نہ کرے</p>

مرزا اسد اللہ خاں غالب

ان کے کلام میں فارسی الفاظ اور ترکیبوں کا استعمال بیشمار۔ مگر الفاظ کی شستگی اور ترکیب کی جیتی بے مثل معانی کثیر کو الفاظ قلیل میں بیان کرنا ان کا خاصہ ہے۔ ابتدا سے عمر میں دہل میں تک تبدیل و اجتر کے طرز پر خیالی مضامین لکھا کیے۔ جب قیصر آئی۔ اس ویوان کو چاک تھرڈ والا ویوان حال میں پھر تونڈ ابتدا فی کلام کا موجود ہے۔

(۱)

دوست غمخواری میں یہی سہمی فرمائینگے کیا؟
بے نیازی حد سے گذری بندہ پر اب تک کیا؟
حضرتِ ناصح گرا آئیں۔ دیدہ و دل فرخ راہ
آج دان تیغ و کفن باندھے ہو جاتا ہوں میں
خانہ زاد زلف ہیں۔ زنجیر سے بھاگینگے کیوں؟
ہے اب اس مہمورہ میں قحطِ غم اُلفتِ اسد
زخم کے بھرنے تک ناخن بڑھ جائینگے کیا؟
ہم کرینگے عرضِ حال اور آپ فرمائینگے کیا؟
کوئی تجکو یہ تو سمجھا دو۔ کہ سمجھائینگے کیا؟
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا؟
ہیں گرفتار و فائزِ زنداں سے گھبرا ئینگے کیا؟
ہم نے یہ مانا کہ دلی میں ہیں کھا ئینگے کیا؟

(۲)

یہ نہ تھی ہمار سی قیمت۔ کہ وصال یار ہوتا
تسے وعدہ پر جیسے ہم۔ تو یہ جان بھٹوٹ جانا
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں سب ناصح
رگِ سنگ سے چمکا وہ ہو۔ کہ پھر نہ تھمتا
کہوں کس سے میں کہ کچھ شبِ غم تیری بلا ہے
اُسے کون دیکھ سکتا۔ کہ یگانہ ہے وہ کیتا
یہ مسائلِ تصوف! یہ ترا بیانِ اقبال
اگر اور جیتے رہتے۔ یہ ہی انتظار ہوتا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے۔ اگر اعتبار ہوتا
کوئی چارہ ساز ہوتا۔ کوئی نگہسار ہوتا
جسے غمِ نیمہ رہے ہو۔ وہ اگر شرار ہوتا
مجھے کیا بڑا تھا مرنا۔ اگر ایک بار ہوتا
جو دلی کی ٹپکھی ہوتی۔ تو کمین و چار ہوتا
تجھے ہم دلی سمجھتے۔ جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۳)

ہوئی تاخیر۔ تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا؛
 تم سے بچا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ
 تو مجھے بھول گیا ہو۔ تو بتا بتلا دوں
 بجلی اک کو زد گئی آنکھوں کے آگے تو کیا!
 پیش میں عیب نہیں۔ رکھیے نہ فرما دو نام
 ہم تھے مرنے کو کھڑے پاس نہ آیا۔ نہ سہی
 کپڑے جاتے ہیں فرشتوں کے کھسے پر ناحق
 ریختے کے تھیں استاد نہیں ہو غالب!

آپ تے تھے سگر کوئی عساں گیر بھی تھا؛
 اس میں کچھ شائبہ خوبی تقدیر بھی تھا
 کبھی نرا اک میں تیرے کوئی ٹخیر بھی تھا؛
 بات کرتے کہیں لب تشہدِ تقدیر بھی تھا
 ہم ہی آشفۃ مشرب میں وہ جاں میر بھی تھا
 آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
 آدمی کوئی ہمارا دم سحر یہ بھی تھا
 کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی تیر بھی تھا

(۴)

گھر جب بنا لیا ترے در پر کے بغیر
 کہتے ہیں۔ جب رہی نہ مجھے طاقت سخن
 کام اس سے اڑا ہے۔ کہ جس کا جان میں
 جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہائے۔ وگرنہ ہم
 چھوڑ دوں گا میں نہ اس بت کا فر کا پوجا
 مقصد ہے ناز و غم نہ دے گفتگوں کام
 ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
 بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہوا لغات
 غالب! نہ کر حضور میں تو بار بار عرض

جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر کے بغیر
 "جانوں کسی کے دل کی میں کونکر کے بغیر
 یوں نہ کوئی نام سنگمر کے بغیر
 سر چائے یا رہے نہ رہیں پر کے بغیر
 چھوڑے نہ خلق کو مجھے کافر کے بغیر
 چلتا نہیں ہے دشتِ ندو خگر کے بغیر
 بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کے بغیر
 سنتا نہیں ہوں بات کر کے بغیر
 ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پر کے بغیر

(۵)	
<p>شبہاے سحر کو بھی رکھوں گرجساب میں میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گرجواب میں گستاخی فرشتہ ہمارے جناب میں نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پاپے رکاب میں جتنا کہ وہ ہم غیر سے ہوں بیچ و تاب میں حیراں ہو پھر مشاہدہ ہر کس حساب میں یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حساب میں مشغول حق ہوں بندگی تو تراست میں</p>	<p>کب سے ہوں (کیا تباؤں) ہاں خراج میں قاصد کے آتے آتے خط اک اور کلمہ رکھوں ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند رو میں ہے خیر عمر کہاں (دیکھئے) تمہیں اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُرا ہے اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے ہے مثل نمود و حضور پر وجود و جسم غالب! اندیمہ دوست سے آتی ہوئے دوست</p>
(۶)	
<p>کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سی اے! وہ مجلس نہیں خلوت ہی سی آگئی گرنیں غفلت ہی سی دل کے خوں کرنے کی عزت ہی سی نہ سی عشق مصیبت ہی سی آہ فریاد کی رخصت ہی سی یہ نیا زمی تری عادت ہی سی</p>	<p>قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے میرے ہونے میں ہے کیا سوائی اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو عمر ہر چند کہ ہے برق خرام ہم کوئی ترک و فاکرتے ہیں! کچھ توفے لے غلبہ نا انصاف! ہم بھی تسلیم کی خود الیس گے</p>
<p>یار سے چھڑ علی جائے آسدا! گر نہیں وصل تو حضرت ہی سی</p>	

	(۷)	
کوئی دن گر زندگانی آؤر ہے آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں ! بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں مے کے خطِ منہ دیکھتا ہے نامہر ہو چکیں غالب ! بلائیں سب تہام		اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے سوزِ غم ہاے نہانی اور ہے پر کچھ اب کے سرگرائی اور ہے کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

خواجہ حیدر علی - آتش

خواجہ حیدر علی نام - آتش تخلص - ان کے والد لدھی سے لکھنؤ آئے۔ خواجہ کو ابتدائے عمر سے شاعری کا چمکا لگا۔ شیخِ معینی کے شاگرد ہوئے۔ غزل گوئی میں شیخِ ناسخ سے مقابلہ ہوا۔ ان کے کلام میں لطفِ محاورات اور گرمی و تاثیر بہ نسبت شیخِ ناسخ کے زیادہ ہے۔

	(۱)	
حُسنِ پرپی اک جلوہ مستانہ ہے اُس کا وہ شوخِ نہاں گنج کی مانند ہے اُس میں جو چشم - کہ حیراں ہوئی - آئینہ ہے اُس کی دلِ قصرِ شمشہ ہے - وہ شوخِ اُس میں شمشاہ وہ یاد ہے اُس کی جو بھلائی دو جہاں کو یوسف نہیں - جو ہاتھ لگے چند درم سے آوارگیِ نگہیت گل ہے یہ اشارہ یہ حال ہوا اُس کے فقیروں سے ہویا		ہشیا و ہشی ہے - کہ جو دیوانہ ہے اُس کا معمورۂ عالم جو ہے - ویرانہ ہے اُس کا جو سینہ - کہ صد چاک ہوا تانہ ہے اُس کا عرصہ یہ دو عالم کا جلو خانہ ہے اُس کا حالت کو کرے غیر - وہ یارِ انہ ہے اُس کا قیمت جو دو عالم کی ہے بیانیہ ہے اُس کا جامہ سے وہاں ہے جو دیوانہ ہے اُس کا آلودہ دیتا جو ہے - بیگانہ ہے اُس کا

شکرانہ ساقی اہل کرتا ہے آتش	سر زمرے شوق سے پیمانے اُس کا
(۲)	
برنگ شمع جس نے دل جلایا تیری دُوری میں ہزاروں حسرتیں جا لٹکی میرے ساتھ دنیا سوے رنج کچھ حاصل نہیں ہے اس خراب میں نظر آیا تماشے جاں جب بند کیں آنکھیں ہوا ہرگز نہ خط شوق کا سماں دست آتش	تو اُس نے منزل مقصود کو زیر قدم پایا شرار و برق سے بھی عرصہ ہستی کو کم پایا غفلت جان جو آرام تو نے کوئی دم پایا صفائے قلب سے پہلو میں ہم نے جام جم پایا سیاہی ہو گئی نایاب اگر کہ ہم نے قلم پایا
(۳)	
نہ تو ریا بھی میسر ہوا بچانے کو مطیع نفس نہ اشد نے کیا مجھ کو نہ بھول بیٹھ کے بالائے سر اسے قمری عجیب بھول ٹھلیاں ہے غفلت ہستی عجب نہیں ہے جو سودا ہو شرگوئی سے	ہمیشہ خواب ہی دکھائیے چھپر کھٹ کا نہ میں نے پیروی غول کی نہ میں نے بھٹکا چڑھے جو بانس کے اوپر یہ کام ہے ٹٹ کا جیسے کہ راہ ہوئی اُس سے خوب ہی بھٹکا خراب کرتا ہے آتش! زبان کا چٹکا
(۴)	
لے چنچ بے مروت اہل بے تنگ مزاجی! بر باد کر نہ ناحق اسے باد صرصر! اُس کو عزت گزینی کا جو میں نے کیا ارادہ بھونک شیاں ہمارے برق آتش گل میری ہی خاک پر کی تھوڑی سی آتش	خوش تیرے گھوس دو دن اک میہاں نہ ٹھہرا بلبل کا آستیانہ برگ خزاں نہ ٹھہرا کنج لحد سے ہتھ کوئی مکاں نہ ٹھہرا پہنے کے قابل اپنے یہ بوستاں نہ ٹھہرا پہروں سمند قاتل ورنہ کساں نہ ٹھہرا

(۵)	
<p>نہیں جاے اقامت دارِ خانی کرتے عینک طلب یہ ناتوانی صبا کی چاہت ہوں مہربانی کہیں ٹٹا ہے یہ داغِ جوانی سبک کرتی ہے مڑوہ کو گرانی کفن سجھے قبائے زندگانی رہی مشتاق گوشِ اپنی کہانی کلام اپنا ہے ہاتھ کی زبانی ہر اک بیت اس میں پہنچ معانی</p>	<p>مسافر کی طرح رہ خانہ بردوش یقین ہے دیدہ بار یک ہیں کو یہ مثبت خاک ہو مقبول درگاہ سفیدی موکی ہو کا فور ہر چند نہ خوش ہو فرہی تن سے غافل موت جو پیشتر مرنے سے وہ لوگ ہو اکوئی نہ حالِ دل سے آگاہ خدا کے حکم سے ہے قوتِ لعل مراد یوں ہے لے آتشِ اختران</p>
(۶)	
<p>چودہ طبق سے باہر محبت نہیں ہے کوئی پنی جائے گا کس کما شربت نہیں ہے کوئی مہندہ رکھے وقت فرصت نہیں ہے کوئی حاضر جو کچھ ہے اس میں نہیں ہے کوئی نا آشناے معنی صورت نہیں ہے کوئی تخلو نہ چاہے ایسی خلقت نہیں ہے کوئی بے اعتبار ایسی دولت نہیں ہے کوئی ہم سبھی غیر خواہ دولت نہیں ہے کوئی</p>	<p>آنگھوں کو کھول اگر تو دیا رکا ہے بھوکا یہ کیا سچے کڑوے ہوتے ہیں آپ ہم سے! میں نے کہا کبھی تو تشریف لاؤ۔ بولے دل لیکے جان کے بھی سائل جو ہو تو حاضر ہم شاعروں کا حلقہ حلقہ ہے عارفوں کا ہر وہ ہزار عالم دم بھر رہا ہے تیرا نازناں نہ شبنم پر پوہماں ہے کوئی دم کا یوں بدکما کر وتم یوں مال کچھ نہ سمجھو</p>

ماوشما کہ وہ کرتا ہے ذکر تیرا	اس داستان سے خالی صحبت نہیں ہے کوئی
(۷)	
منزل ہی دُور ہے۔ جو یہ ہو سچ نہیں منزل دیکھلائے سیر آنکھوں کو یا ہم مراد کی تافہمی کی دلیل ہے یہ سجدے سے ابا افسوس کیا جو انی رفتہ کا کیجیے ناولوں سے ایک دن نہ کیے گرم گوش یار	دم لینے والی راہ میں عمر رواں نہ تھی ایسی کوئی کندہ۔ کوئی نردیاں نہ تھی ابلیس کو حقیقت آدم عیاں نہ تھی وہ کون سی بہارت تھی۔ جس کو خزاں نہ تھی آتش اگر تھامے دہن میں نیاں نہ تھی

شیخ امام بخش ناسخ

شیخ امام بخش نام۔ ناسخ مخلص۔ لکھنؤ کے مشاہیر شعرا سے ہیں اور اپنے وقت کے استاد۔ میر تقی
مصطفیٰ۔ انشا۔ جرات کا اخیر زمانہ دیکھا تھا۔ خواجہ آتش کے معاصر تھے کلام اُن کا اصول
فن کے مطابق نہایت چنچا۔ نکلا۔ تشبیہ و تمثیل سے معمور۔ مگر دلا دیزری و تاثیر کم ہے

(۱)	
انسان کو انسان سے کیسے نہیں اچھا آواز یہ آتی ہے لب آپ بقا سے ہو سیر جو منظور دلا بھر جہاں کی	جس سینہ میں کینہ ہو۔ وہ سینہ نہیں اچھا مرتا ہی یہاں خوب ہے جینا نہیں اچھا جز کشتی درویش سفینہ نہیں اچھا
(۲)	
دشمن سر پہ تری گردن کشی مانند شمع زندگی میں صرف کرتا ہو سبکدوشی حصول چاہیے تعمیر دل۔ جو ساتھ اٹھا لیجائے گا	افسر زرق و برق سے رکھ پر نہ اتنا مسر اٹھا مثل قاروں خاک میں جا کتر بارز اٹھا یوں خرابی کے لئے دیوار اٹھا یا در اٹھا

<p>بات جن نازک مزاجوں سے نہ لکھی تھی کبھی کیا سخن سخی سے حاصل جب غفلت ہی نہیں</p>	<p>بو جھ اُن سے بیکر دل میں خاک کا کیونکر اٹھا زنا سے فکر سے لے کر ناسخ تو اپنا اٹھا</p>
(۳۳)	
<p>ہو وطن میں خاک میرے گوہر مضمون کی قدر ہوتی ہے غربت میں شہوت پر پڑی اینکے بعد اعتماد اصلا نہیں گر ہے جہاں زیر نگین آج تو پوشاک پر ہر تہہ تو کل دیکھیو</p>	<p>اصل قیمت کو پہنچتا ہے بد خشناں چھوڑ کر بچ اٹھائے گھر قریب سے کنعل چھوڑ کر اٹھ گیا دنیا سے خاتم کو سلیمان چھوڑ کر جائیکا تاش تیری لاش عریاں چھوڑ کر</p>
(۳۴)	
<p>خوش قدوں کی خاک یہ لکھی ہے ہر دم سرور آج نقاشی کی چھت لگوا نہیں مانع کوئی دوست دشمن سب کے سب ہیں رفتی شلیم دوہا جاتے تھے جن کے سامنے شیر زیاں بے وطن ہو کر نمانہ میں ہوئے نالائاں بشر</p>	<p>گرد یاد لے اہل غفلت! اس بیاباں میں نہیں کل بھر خفاش کوئی سقف ایوان میں نہیں کل تو کیا بکا نا بھی ک دن گھٹیل میں نہیں غیر روایہ و شقال بلان کے ایوان میں نہیں آشنا ناوں سے ہر گونے نبتاں میں نہیں</p>
(۳۵)	
<p>دور و ز ایک وضع پر رنگ جہاں نہیں حاصل تھے بصارت یعقوب ہو اگر سغم کے شکر میں بھی ہلائیں کبھی کبھی</p>	<p>وہ کو نسا چمن ہے ہر گرج کو خزاں میں یوسف بغیر کوئی ہیاں کارماں نہیں تہا ہما سے لذت دنیا زباں نہیں</p>
<p>پڑ مردہ ایک ہے تو شلفہ ہے دوسرا بارغ جاں میں فصل بہار و خزاں نہیں</p>	

(۶)	
<p>کہ اس قس سے لگتا ہے نہ ترکی کو نہ تازی کو اکھی کیچو تو فحیاب اس مرد غازی کو نہ کیونکر خاکساری سے وہ بے سرفرازی کو</p>	<p>بیاں کیا ہو سکے عمر دہاں کی مجھ سے جالاک ہاکیلا دل ہر افوج تما کے مقابل ہے نثر خجہ جو ہے (ملے خلم بول) باغ عالم میں</p>
(۷)	
<p>یہ صدا آتی ہے ہر دم تربت قیور سے مانگتا ہے کب کوئی جا کر عمل زنبور سے بار غم دنیا میں اٹھو آئے نہیں زبور سے بنتے ہیں جام گدا خاک فقور سے</p>	<p>یا فکستہ جو ہے کہ کتابہ جہاں میں سلطنت منعم موزمی کے گھر کو اہل حاجت ٹولیں بانٹ لے کوئی کسی کا درد یہ مگر نہیں دیکھنا داسے اہل عبرت با مقام آسمان</p>

شیخ قلندر بخش جرات

قلندر بخش نام - جرات تخلص - اکبر آبادی مشہور ہیں۔ مگر ان کے والد جلی کے رہنے والے تھے۔
کھنویں پہنچ کر ان کی غزوں نے شہرت پائی۔ عین جوانی میں تابیہ ہو گئے۔ عہدہ عویں انتقال
کیا۔ تیرا نشا اور معنی کے معصر تھے۔ ان کے کلام میں تیر کی سی سادہ بیان اور لطافت عائدہ تو ہے۔
مگر معانی رندی دہوا پرستی کی حدت باہر کم نکلتے ہیں۔

(۱)	
<p>تو ہنس کے دہ بولے ہے۔ میاں ٹکڑ کرنا غزیت کے سوا کوئی نہیں ہم سفر اپنا ماقم کدہ ہم کو نظر آتا ہے گھر اپنا بے عیب۔ کرے کوئی جو ظاہر ہنر اپنا</p>	<p>غم رو رو کے کہتا ہوں کچھ اس سے اگر اپنا باتوں سے کئے کس کی بھلا راہ ہاں ہی عالم میں ہے گھر گھر خوشی و عیش پرکس بن ہر بات کا بہتر ہے چھپا نا ہی۔ کہ یہ بھی</p>

کیا کیا اسے دیکھ آتی ہے جرات! میں حیرت	ایو س جو بھرتا ہے پیغامبر اپنا
(۲)	
بلبل سنے نہ کیونکہ نفس میں جن کی بات عیش و طرب کا ذکر کروں کیا میں۔ دُعا شاید اسی کا ذکر ہو۔ ہرگز میں میں جرات! خزاں کے آتے جن میں رہا کچھ	آوارہ وطن کو لگے خوش وطن کی بات مجھ غمزدہ سے پوچھیے رنج و محن کی بات سنا ہوں گوش دل سے ہر کس وطن کی بات اک رہ گئی زباں بہ گل و یاسمن کی بات
(۳)	
صوتِ بلبل دلِ نالاں نے سنائی تجکو لافل خاطر میں نہ میں سلطنتِ ہفتِ ظہیر صلح میں جس کی نہیں چین۔ اندیشہ وصل میں جس کے نہ تھا چین۔ سو جرات! میں	سیرِ گل دیدہ گریاں نے دکھائی تجکو اس گلی کی جو میسر ہو گدائی تجکو آہ! دکھلائی گی کیا اس کی لڑائی تجکو وہ گیا پاس سے اور موت نہ آئی تجکو
(۴)	
اتنا تھلا مجھے ہر حال میں ہوا کہ تو کم ثباتی مری ہوم ہے فاطمہ بچا بہ تا تو انی مری گلشن میں یہ ہی بجھے ہے دوستی کر کے جو دشمن ہو تو جرات کا	میں ہر اک شخص سے رکھتا ہوں سر دکا کہ تو دیکھیں تو۔ پہلے ہم اس بحر سے ہول یاد کہ تو دیکھیں۔ لے نکمتِ گل! ہمیں کیا کہ تو بیوفا وہ ہے۔ پھر لے شوخ سنگار کہ تو
(۵)	
دی خبر یک صبا لے کیا گلشن میں جو آہ منصبِ پیری روز اس کا اہتمام ہے آہ	غنجِ پیر مرہ ساں دل کی کلی مڑھائی قیل ازیں عمر جو انی جو مڑھائی

اُس سے کیوں بچتے ہے کیا سودا چڑھا جھکو دلا اے اہل! بس یہ تو رسوائی نہ دیکھی جاہلیگی اب ڈھٹائی سمجھیہ اس کو جرأت جانے	وہ نہیں گر آپ ہیں تو تو ہی بس کر جاگتی طبع غمخواروں کی اپنے اب بہت اکتا گئی آہینگے جی۔ آہینگے! اب تو طبیعت اکتی
--	---

(۶)

مشکل ہے۔ جو آوے وہ احاطہ میں خدے دعویٰ نہ کر سہر ق کبھی اپنی تربط کا قاتل ہو وہ سکتے۔ تو ابھی ڈر کے یہ بھاگیں	گو اُس کا تصور کوئی اور اک سے باندھے گر پانوں ترے تو سن چالاک سے باندھے جو تیغ و سپر پھرتے ہیں بے باک سے باندھے
---	---

سید انشاء السد خاں انشا

انشاء اسد خاں - انشاء مخلص - شفا سے دہلی سے تھے۔ استعدادِ علمی میں لائق و فائق۔ فارسی عربی - ترکی سے اہر - شیخ متعینی نے ان کو فیضِ زمان کلمہ ہے کلام میں ہزل و لطافت زیادہ ہے۔ اگرچہ صاف اور سنجیدہ ہوئے فن و نظیر - تیسرے متعینی و جرأت کے مجسم تھے۔ غالب معنی الدلہ کے حمد میں لکھنؤ پہنچے ۱۲۸۸ھ میں بحالت دیوانگی انتقال کیا۔

(۱)

جس شخص نے کہ اپنی غوث کے بل کو توڑا اپنا دل شکستہ تالا ب کا کنول تھا تھا ساعتِ فرنگی۔ دل چپ جو ہو رہا ہے دار او جہ نے تھر سے کیا کیا شکست پائی یعنی ہے جس دل تو ظالم تو آج سے چمک احوال خوش آنکھوں کا انشا میان ہضم	راہِ خدا میں اس نے گویا جبل کو توڑا افسوس تو نے ظالم! ایسے کنول کو توڑا کیا جلیے کہ کس نے ہے اس کی کل کو توڑا اے چرخ! تو نے کس کس اہلِ قول کو توڑا بڑھ جائیگا دگر نہ پھر اس کا کل کو توڑا اُس ذاتِ محبت سے مل بند اہل کو توڑا
--	--

	(۲)	
<p>اب کس کو ہے اعتبار تیرا مجھ سائیک رنگ یار تیرا میرا کیا! اختیار تیرا ہے بندہ جاں نثار تیرا</p>		<p>جھوٹا نکلا قسار تیرا واحد! کہ کام آ رہے گا کہ جبرِ جہاں تلک تو چاہے انشائے بد روٹھ میت خفا ہو</p>
<p>دول لگ رہی ہو جیسے گرمی میں بن کے اندر گویا زباں نہیں ہے اپنے دہن کے اندر ہیں بکلی میں شبنم کے پیر ہن کے اندر یہ رنگ گورے گورے کیونکر کفن کے اندر یعقوب وارہم کو بیت الحزن کے اندر ہیں طرفہ ہم سا فراسے وطن کے اندر</p>	(۳)	<p>شعلے بھڑک رہے ہیں یوں اپنے تن کے اندر جو چاہا ہو تم سو کہ لوچ چپ چاپ ہیں ہم ایسے گل سے زیادہ نازک جو دلیرانِ رعنا ہے جگہ یہ تعجب ہو ونگے پانوں پھیلا غم نے ترے بٹھایا۔ اے ماہِ مصر خوبی یوں بوتا کہ ہے سنے ہو میرا انشا</p>
<p>سورنگ کے شگفتہ ہیں گل شاخسار پر جاتی ہے چٹ نگاہ پھل بنو ناز پر تاک اینٹے ہیں مست پڑے جو بیار پر کچھ آگ سی لگائی ہے آگ ہمار پر</p>	(۴)	<p>شادابی ہو ا میں یہ کیفیت اب کے ہے نظارہ سوے دانہ شبنم اگر کروں اشجار جھومتے ہیں پڑے سخنِ بلغیر سورج بہار لالہ خود روئے اسے نیم</p>
<p>چھڑ دو اس کو دوستو! تیرا قلم تراش ہے</p>	(۵)	<p>نکلے ہے غول ٹھہر غول کے ہر اک خواش</p>

<p>ہم کو مصاحبوں سے ہے آپ کے کیا بربری موسم گل ہے دوستو! جائے وہ سیر بلخ کو حضرت عشق را در میں بہتے ہو یا حرم میں تم ہے یہ دور روزہ زندگی ہم کو وبال گردن آہ</p>	<p>ہم ہیں مکینہ اک غلام فرقہ خواجہ ماش سے اٹھنے کی تاب جس کو ہو تکیہ گہ فراش سے عجکونیں کچھ اطلاع آپ کی بود و باش سے لے دہ خوشا جو چھٹ گئے دفعہ ماش سے</p>
<p>یہ جلتے تر تم ہے۔ اگر سمجھے تو صیاد آئی ہے نظر اس کی تجلی ہیں زاہد! کیا پوچھتے ہو؟ عمر کئی کس طرح اپنی ہر بات میں یہ جلدی ہے۔ ہر چیز میں اصرار انسانے گر گوش اٹھم ہوں نہ تو آؤ سے</p>	<p>(۶)</p> <p>میں او بھیسوں اس طرح اس کنج نقص میں ہر چیز میں بہنگیں، ہر خاں جس میں جزر و زدد کیا کبھی اس تین برس میں دنیا سے زالی ہیں غرض تیری تو رسمیں آواز تجھے یار کی ہر بانگ جسد میں</p>
<p>نبھ گئی بندہ درگاہ سے اور آپ سے خیرا راہ رو! چونک کہ ہے قافلہ میں تیاری قری و مہل نالاں میں پڑے جو جھگڑے اشک آنکھوں سے قدم نگہ نہیں سکتے باہر تصدیک گاہ مناسب ہی نہیں صاحب کو جی ہی اچھا نہ رہا پھر تو عیاذ آبا خدا!</p>	<p>(۷)</p> <p>ہم آفت میں اگر ایسے ہی آئیں ہوے محل اونٹوں پہ بندے، فوج میں نہیں ہوے سودا غمزدہ کے تو جب تسکین ہوے دولت شرم سے مانند سلاطین ہوے گرچہ معلوم تجارت کے سب آئیں ہوے فائدہ کیا! جو ثناساے ار اکین ہوے</p>
<p>کر بیٹھے وہیں فضل خداداد پہ تکیہ</p>	<p>(۸)</p> <p>جب بن نہ پڑی بات کچھ اپنی نگاہ سے</p>

<p>جان اہل توکل انھیں اشخاص کو جو ہیں اے دل! وہ خوشا گشت برومند کجس کو افواج گل و لالہ میں ہے زلزلہ انشا</p>	<p>محفوظ پیاز و نمک و گردہ جو سے خطرہ ہی نہیں تھلکہ وقت درو سے اس باد بہاری کی سواری کی جلوت سے</p>
<p style="text-align: center;">شیخ غلام احمد انصاری مصحفی</p> <p>غلام احمد انصاری تام - مصحفی تخلص - وطن اصلی مردہ - دہلی میں آکر علوم رسمہ حاصل کئے - آصف الدولہ کے زمانہ میں کھنڈ پونچے - اور ریختہ گوئی میں تیر و ہنود اسکے بعد علم استاد دی بند کیا - خود قلم نہیں لے اے مصحفی شاعر نہیں پورب میں ہوا میں + دہلی میں بھی چوری مراد یوان گیا تھا : ان کا کلام نہایت صاف و شستہ ہے کہیں بطر سودا کہیں بطر تیر +</p>	
<p>(۱)</p> <p>نظارہ کروں دہر کی کیا جلوہ گری کا کیا لطف مقام آن کو! جو شاق عد میں کیا بھیجے قاصد کو دہاں! کوچ میں جس کے ترتیب پہ مری رگ گل سناڑہ چڑھائے بندہ ہے ترا مصحفی خستہ کو یارب!</p>	<p>یاں عمر کو وقفہ ہے چراغ سحری کا دل کو ج میں رہتا ہے ہمیشہ سحری کا جبریل کو مقدور نہیں نامہ بری کا احسان ہے مجھ پر یہ نسیم سحری کا محتاج طبیبوں کی نہ کر چارہ گری کا</p>
<p>(۲)</p> <p>بوسے محبت اپنی رکھی خدا نے اس میں اپنی تو اس چمن میں عمر اس طرح سے گزری گریم سوئے ہم - منزل کو پر نہ پونچے اے مصحفی! اگر بیاں سارا امو سے تر ہے</p>	<p>سینہ میں آدمی کے دل عطر ذراں بنایا یاں آشتیاں بنایا داں آشتیاں بنایا آوارگی نے ہم کو - ریگ روں بنایا یہ رنگ اپنا عالم! تو نے کہاں بنایا</p>

	۳	
اپنے رہنے کو مکاں چاہیے تنہائی کا کیا بگاڑا تھا بھلا گنبدِ مینائی کا کس قدر یار کو غم ہے مری تنہائی کا شوریاں گردِ بے مرزا کی بھی مرزائی کا		ہے یاں کس کو دماغِ انجمنِ آرائی کا شیشہ دل کو مرے چور کیا کیوں اُس نے؟ بھینج دیتا ہے خیال اپنا عوض اپنے دماغ مصحفی! رینیتہ ہو بچا مر اُس رتہ کو
	(۶۷)	
یہ منہ نہ کھتے تیرا ہے۔ کہیں کچھ نہیں کہتا تھکوا ہی سودا ہے۔ کہیں کچھ نہیں کہتا تو عالمِ دوا ہے۔ کہیں کچھ نہیں کہتا بعضوں کا مقولہ ہے۔ کہیں کچھ نہیں کہتا		کیا غیر کا کھٹکا ہے؟ کہیں کچھ نہیں کہتا دیوانے جو ہوتے ہیں کہا کرتے ہیں کیا کیا جو چاہتے ہیں۔ تھکوا وہ کہتے ہیں رخصت اے مصحفی! بعضے مرے کہنے کے ہر قائل
	(۵)	
ہے شہیدوں کا یہاں کس کس کے رخِ اصبا تلبلیس کرتی ہیں کس گشتہ پہ شیون لے صبا گشت گئے جب بلغم میں بھولوں کے عین لے صبا ابکہ ہولی میں بنانا گل کو جو گن لے صبا		لوے خوں دیتا ہے کچھ تھکوا یہ گشتِ اصبا کس کے نام ہیں جسے ہیں گل ہزاروں سنہ چکا ہم اسیرانِ قس کو تب جلدی تو نے آہ! ڈال کر شبنم کے مندرے بے محلف کان میں
	(۶)	
معلوم نہیں تھکوا۔ کہیں کون ہوں کیا ہوں یا خود ہی میں شاہد ہوں کہ پردہ میں بچا ہوں ہوں ہست۔ مگر ہستی عالم سے جدا ہوں		مشتوق ہوں یا عاشقِ مشتوقِ ناہوں ہوں شاہدِ تشریہ کے رخصارہ کا پردہ ہستی تو مری ہستی عالم نہ سمجھنا

<p>سوزِ جگر و دل ہوں۔ کبھی ناز و ادا ہوں میں عطر نسیمِ حُب و یادِ صبا ہوں حق یہ ہے کہ میں سازِ حقیقت کی صبا ہوں ہر چند کہ خود عقدہ و خود عقدہ کشا ہوں ہر رنگ میں میں منظرِ انوارِ خدا ہوں</p>	<p>انداز میں سب عاشق و معشوق کے مجھ میں ہے مجھ سے گریبانِ گل و صبحِ منظر گوشِ شنوا ہو۔ تو مرے دم کو سمجھے یہ کیا ہے۔ کہ مجھ پر مرا عقدہ نہیں کھلتا اے مصحفی! تائیں میں مری جلوہ گری میں</p>
<p>(۷) کچھ۔ ان دنوں تو میرے بچن سے جھڑ گئے ہیں کشنوں کے ہر گلی میں سحرِ اوڑھ گئے ہیں منزلِ پیہرے ساتھی مجھ سے بچھڑ گئے ہیں بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں گڑ گئے ہیں</p>	<p>(۷) چہرہ اتر رہا ہے۔ لفتے بگڑ گئے ہیں تلوارِ رنج کے جب وہ نکلا ہے گھر سے باہر روتا پھروں نہ کیونکر میں قافلہ میں ہر سو اے مصحفی میں رڈوں کیا اگلی محبتوں کو</p>
<p>(۸) شکستہ حالِ دغریب و فقیر ہر چہ میں وہی شہر پر نہیں۔ کچھ شہرِ ہم بھی ہیں کہ اپنے عہد کے مرزا و تیسرے ہم بھی ہیں</p>	<p>(۸) طالع کی خونیں ایسوں کی پرورش ورنہ یہ درمیاں جو مینوں بگاڑ رہتا ہے حسد کی جانیں اے مصحفی! کلامِ ان کا</p>
<p>(۹) سبزہ کی سوچ نے پھر سلسلہ جنیاں کی میری صورت سے حقیقت مری میرانی کی اس کو کیا فکر مری بے سرو سامانی کی قدسِ شہزادی کی ہواں نہ صفا ہانی کی</p>	<p>(۹) تو بہار آئی ہے۔ سوداے کُن تازہ ہوا ہوں وہ غارت زدہ بہر و سکے خودا رہے صفا عوہ و دم جو ہے اپنی ہی آرائش کا مصحفی! اوں میں جہاں رینے لگی کوئی</p>

میر محمد تقی میر

حالات کے لیے دیکھو صفحہ ۲۰ حصہ نغم

	(۱)	
<p>آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟ یہ غافل ہم چلے سوتا ہے کیا؟ تخم خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا؟ دل غ چھاتی کے عبث ہوتا ہے کیا؟ میر اس کورا نگاں کھوتا ہے کیا؟</p>		<p>ابتداء عشق ہے روتا ہے کیا قافلہ میں صبح کے اک شور ہے سبز ہوتی ہی نہیں یہ سبز میں یہ نشانِ عشق میں جاتے نہیں غیرتِ یوسف ہے یہ وقتِ عمرین</p>
	(۲)	
<p>جو کوئی دم ہے تو افسوس ہے جوانی کا سخن رہے گا سد امیری کم زبانی کا خیال بھی سکھو گذرا نہ پر رفتاری کا کہ تو میر بھی اک سبیلہ تھا پانی کا</p>		<p>دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا اگرچہ عمر کے دنوں میں یہ لب ہے خاموش ہزار جان سے قربان بے نیچی کے نمود کر کے وہیں بحرِ غم میں ڈوب گیا</p>
	(۳)	
<p>نہ پیش آئے اگر مرحلہ جدائی کا دماغ کس کو ہے ہر دم کی جہہ سائی کا خیال ہم کو بھی ہے بخت آزمائی کا سروں پہ اپنے ہے احساںِ شہسائی کا کوئی شریک نہیں ہے کسو کی آئی کا</p>		<p>طریقِ خوب ہے آپس میں آشنائی کا یہیں ہیں دیر و حرم اب تو حقیقت ہے کشتہ پاڑ میں جل کو بکن سربِ مار رکھا ہے باز ہمیں در بدر کے پھرنے سے جناں میں میر جی کے ساتھ جانا تھا لیکن</p>

(۴۱)	<p>موم سمجھے تھے ترے دل کو سو پتھر بکلا جانا جانتا ہے کہ اس راہ سے لشکر بکلا ایک سے ایک عدد آنکھ سے بہتر بکلا سیر ترانہ تو اک شوق کا دفتر نکلا</p>	<p>جہر کی تجھ سے توقع تھی - شکر نکلا دل کی آبادی کی اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ اشک تر - قطرہ خوں بخت جگر بارہ دل ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف لے تیر</p>
(۵۰)	<p>ہر چند کہ جلتا ہوں یہ مگر مہ دفا ہوں ہوں غنچہ افسردہ کہ مرد و صبا ہوں یار سے غنیمت ہے کہ جیتا تو رہا ہوں ہے وقت دعا تمیر کہ اجل کو ٹھکا ہوں</p>	<p>مستوجب ظلم و ستم و جور و جفا ہوں اس گلشن دنیا میں شگفتہ نہ ہوا میں گو طاقت و آرام و خور و خواب گئے سب سینہ تو کیا فضل الہی سے بھی چاک</p>
(۶۱)	<p>میں ورنہ وہی خلوتی رازنما ہوں صد رنگ مری موج ہو میں طبع دوا ہوں میں باعث اشتغلی طبع جہاں ہوں اس باغ خزاں دیدہ میں ہیں برگ نرمل ہوں در پے نہ ہو - اس وقت خدا لجا نکلا ہوں</p>	<p>لایا ہے مرا شوق مجھے پردے سے باہر جلوہ ہے مجھی سے لب دریا سے سخن پر دیکھا ہے مجھے جس نے یو دیوانہ ہے میرا ہوں زرد غم تازہ نہا لان جن سے رکھتی ہے مجھے خواہش دل بسکہ پریشاں</p>
(۷۱)	<p>جی میں ہم نے یہ کیا ہے اب مقرر ہو سو ہو ایک دن تو ٹوٹا پڑے حیدر تیرا ہو سو ہو</p>	<p>رکھے گردن کو تری تیغ ستم پر ہو سو ہو قطرہ قطرہ اشکباری تاکجا پیش سحاب</p>

بن نہیں ناز و نعم ہی کے رہے کیونکر فقیر
صاحبی کیسی؟ جو تم کو بھی کوئی تم سا ملا
یہ فضولی ہے۔ فقیری میں کیسے ہو سوا
پھر تو خواری بے وقاری بندہ پروردگار ہو
ہیں شریک اس میر جم بھی تیرے ہوتے ہو

(۸)

وہ اپنی ہی خوبی پہ رہتا ہے نازاں
نہ رکھتی مری خاک بھی اُس گلی میں
مرو یا جیو کوئی اُس کی بلا سے
کدورت مجھے ہے نہایت جبا سے
تعب نہ تھکے ہے حجب ماسوا سے
کہ بیٹھے ہیں یہ قافیے کس ادا سے
نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت
کہو میر جی! آج کیوں ہو خفا سے

(۹)

اپنی ہستی حباب کی سی ہے
چشم دل کھول اس ہی عالم پہ
یہ نمائش سراپ کی سی ہے
یاں کی اوقات خواب کی سی ہے
اُسی خانہ خراب کی سی ہے

(۱۰)

تصویر کے سے طائر خاموش رہتے ہیں جم
جب کو زندگی ہے بکلی تب جان بگستاں
جی کچھ اچھٹ گیا ہے اب نالہ و غل سے
رکھتی ہے چھیر میرے خاشاک آئیناں سے
جیلن ہیں میں۔ پتھر غلی کی تمہیں کہاں سے

راتنی بھی بد مزاجی! ہر خطہ میر نم کو
الجاؤ ہے زمیں سے جھکڑا ہے آسمان سے

مرزا رفیع سودا

مرزا محمد رفیع نام سودا بخلص۔ ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے دلی ان کا مولد و مسکن ریختہ گوئی میں شاہ
حاکم کے شاگرد۔ مثلاً ہجری میں لکھنؤ چلے گئے۔ مثلاً ہجری میں وہیں انتقال فرمایا۔ ان کا کلام
رنگارنگ ہے۔ کہیں صاف و سادہ کہیں تشبیہ و استعارہ۔ فارسی ترکیبوں کا استعمال غلبان تکرار
اگرچہ اصناف سخن میں استاد مسلم ہیں۔ مگر ان کے قصائد ہجو میں خصوصیت کے ساتھ مشہور ہیں۔

	(۱)	
جوں شمع سراپا ہوا اگر صرف زباں کا کھلتا ہے ابھی بل میں طلسمات جہاں کا جب چشم کھلی گل کی۔ تو موسم ہے خزل کا دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا	بیز	معدور نہیں اس کی محلی کے بیاں کا پر دہ کو قعین کے دردل سے اٹھائے اس گلشن ہستی میں عجب دید ہے لیکن ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے را
	(۲)	
لو میں غرق سفینہ ہو آستانہ ملی کا کہ جن نے دل سے مٹایا خلش لبانی کا جلانہ پشہ سے کچھ بس تری خدائی کا پھر ہے اپنا وہ کانسہ بے گدائی کا		اگر لکھوں میں اگر تیری بو خانی کا زباں ہے نکر میں قاصر شکستہ بالی کے دماغ جھڑ گیا آخر نہ تیرا۔ اسے مرو د! طلب نہ چرخ سے کرناں راحت اسوا
	(۳)	
بسم۔ اسے آؤ شربار کہ خبل جاؤں گا کیوں تھا ہوتے ہو پل مرتے دھج جاؤں گا		لطف سے اشک کہ جس شمع ٹھلا جاتا ہوا خطرہ اشک ہوں پیایے! مرے نظارہ سے

<p>تو کئے کج ہی جائیں کھن کل جاؤں گا بھاڑ کر کیڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا اُن کی خدمت میں سے میں غیل جاؤں گا</p>	<p>اس مصیبت سے نومت بھگوان ال گھر سے چھوٹت باد ہاری اکہیں گل نکلت گل اکتہ میں وہ جو ہے ستود کا قصیدہ ہی خوب</p>
(۴)	
<p>قل کوئی دل کا نگر کر گیا قافلہ یاروں کا سفر کر گیا حال مرا سب کو خبر کر گیا خترم و خنداں ہو گذر کر گیا شام سے رور و سکے سحر کر گیا ہر کوئی اک طرح بسر کر گیا</p>	<p>قاصدا شک آ کے خبر کر گیا دیکھیے! در ماندگی اب کیا دکھائے کیونکر کوئی کھلے ترا اب فریب ایک جو مانند گل اس بلغ سے آن کے شبنم کی طرح دوسرا کیا تھے اب فائدہ اس فکر سے</p>
(۵)	
<p>ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں چمن کو ترے کوئی دم دیکھتے ہیں جو کچھ دوست اپنے سے ہم دیکھتے ہیں اُسے ترے کو چہیں کم دیکھتے ہیں</p>	<p>گدا دست اہل کرم دیکھتے ہیں حباب لب جو ہیں اسے بانگیاں ہم خدا دشمنوں کو نہ وہ کچھ دکھائے مگر تجھ سے رنجیدہ خاطر ہے ستودا</p>
(۶)	
<p>جو داغ دل کی اپنے ہم وعدہ جانتے ہیں ہم گھر کو آسماں کے پتہ دود جانتے ہیں جو مرد نکل ہستی نابود جانتے ہیں</p>	<p>مجر کا دخل کیا ہے مغل میں تشنگاں کی اپنا چراغ دل کا جس دم سے بج گیا ہے آئینہ ساری ان کو ہے کفر اسے سکندر</p>

جس خشت کو اٹھا کر دکھیں وہ چشمِ دل سے
کیا شکر کیا شکایت اپنی ہی شکل سے ہے
عجز و غرور دونوں اپنی ہی ذات میں ہیں
ہم سرِ نوائیں کس کے آگے کہ بید آسا
صورت کو اپنی اُس میں موج د جلتے ہیں
دونوں سے آپ کو ہم مقصود جلتے ہیں
ہم عبد سے جدا کب معبود جلتے ہیں
اپنے قدم کو اپنا مسجود جلتے ہیں

(۷)

تو ہی کچھ اپنے سر پر نیاں خاک کر گئی
کیجو اثر قبول کہ تجھ تک ہماری آہ
دیوانہ کوں گل ہے ترا جس کو بلغ میں
خانہ خراب دل تو ہے لیکن میں کیا کویں
مست پوچھ یہ کہ رات کئی کیونکہ بھر بغیر
ظالم کرو و گل کا گریباں ہوا ہے چاک
پروانہ کون سا نہ جلا شام کو کہ شمع
شبم بھی اس چین سے صبا! چشم تر گئی
سینہ سے ارغیاں لیے داغِ جگر گئی
زنجیر کرنے موجِ نسیم سحر گئی
جیسی بلاے جان ہے یہ آنکھ گھر گئی
اس گفتگو سے فائدہ پیارے! گند گئی
اک عذیب گرا جل اپنی سے مر گئی
روئی ہوئی نہ بزم سے وقت سحر گئی

(۸)

نسیم ہے ترے کوچے میں ادھیا بھی ہے
ترا غرور مرا عجز تا کجا - ظالم!
زبانِ شکوہ سوا اب زمانہ میں مہیات
ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر ہمیلا
ہماری خاک سے (دیکھو تو) کچھ راہی ہے
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے
کوئی کسی سے بہر گیر آشنا بھی ہے
چمن جن کہیں بیل کی اب نوا بھی ہے

سمجھ کے رکھو قدم خارِ دشت پر بھنوں
کہ اس نواح میں ستودا ہر پہنہ پا بھی ہے

خواجہ میر درد

خواجہ میر نام - درد تخلص - دہلی کے ارباب طریقت دار شاد سے تھے - ان کا دیوان رکتہ نہایت مختصر ہے غزلیات تمام تر عارفانہ - خوبی زبان و سادگی بیان کے لحاظ سے مقبول خاص و عام میر و میزنا کے بمقصر تھے - ۹۵ھ ہجری میں ۶۸ سال رحلت فرمائی :-

	(۱)	
<p>حقاً کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا کیا تاب؟ گزر رہوے تعقل کے قدم کا آہا دہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا اور دل میں بھر و ساہے تو ہے تیرے کیم کا کھینچا نہ پر اس بھر میں عرصہ کوئی دیر کا</p>		<p>مقدور ہیں کب ترے صفوں کی رقم کا اُس مسندِ عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے بیتے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب سے یا نہ جواب آنکہ تو اے درد! کھلی تھی</p>
	(۲)	
<p>اس طرف کو بھوکھو گزرتہ کیا نہ کیا تو نے رحم پر نہ کیا کیا ہے اظاہر میں گو سفر نہ کیا خانہ آباد! تو نے گھر نہ کیا بے ہنر! تو نے کچھ ہنر نہ کیا</p>		<p>کلب کے ہاں تم ہوئے کرم فرما دیکھنے کو رہے تر سے ہم آپ سے ہم گزر گئے کب کے کو نسا دل ہے وہ؟ کہ جس میں آوا سب کے جوہر نظر میں آئے درد</p>
	(۳)	
<p>گرد و مہاں حساب نہ ہواں دباہ کا یا رب ہے کون پھر تو ہاں سے گناہ کا</p>		<p>لیکھ ازل سے تا یہ اب ایک آن ہے رحمت قدم نہ رنجہ کرے گری تری ادا دھر</p>

<p>شاہ و گناہ سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں سوار و کھیر میں نے تری بیوقوفانیاں اسے در و دیوار ہی نہیں محو جذبہ عشق</p>	<p>نے تاج کی ہوس۔ نہ ارادہ کلاہ کا تس پر بھی نبت غرور ہے دل میں باہ کا کچھ کد با سے بس نہ چلے برگ کاہ کا</p>
<p>ہم تجھ سے بس ہوس کی فکر! تیرا تو تردا منی پہ شوخ! ہمارے نہ جا۔ ابھی سر تا قدم زبان ہیں جوں طمع کو کہ ہم ہر چند آگے ہوں پر اٹھا ہوں باتوں نے گل کو ہے ثبات۔ نہ ہم کو ہے اعتبار</p>	<p>(۴۱)</p> <p>دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں دا من بچو دیں۔ تو فرشتے وضو کریں پر یہ کہاں نال؟ جو کچھ گفتگو کریں مٹھ بھیرے وہ جس کے مجھے رو برو کریں کس بات پر چین! ہوس رنگ و بو کریں</p>
<p>یاں عیش کے پردہ میں بھی دل شافی نہ آگے جو بلا آئی تھو، سودل پہ ٹائی تھی اسے در و دیوار سے کہوں باز رحمت</p>	<p>(۵)</p> <p>ہر نرم طرب جوں مزہ برجم زدلی ہے اب کے قمری جان ہی پر آن بنی ہے عالم میں سخن چینی ہے یا طعنہ زنی ہے</p>
<p>دیکھے جس کو یاں اسے اور ہی کچھ مانع ہے غیر سے کیا معاملہ آپ ہیں اپنے دام میں حال مرانہ تو چھبے میں جو کہوں ہو کیا کول تنتے ہیں بس کہ آہ تو ہم ہی میں ٹھپے پاکیں مخلف دل ہوئی تکرر نہ کہوش خلق و درود</p>	<p>(۶)</p> <p>کر یک شب چراغ بھی گویا چراغ ہے قید خودی نہ ہو اگر بچو توجہ فراغ ہے دل ہے سولش پیش ہے سیدہ سولش دل ہے ایتی تلاش سے غرض ہم کو ترانہ فراغ ہے میلک داستان میرا دینہ ہر اکین فراغ ہے</p>

قصائد

امیر الشرائش امیر احمد صاحب امیر مینائی

نخب کاغذ پہ ہوا صد شیش شاہ قلم
میں جو یہ عرصہ کاغذ پہ حروف و حرکات
ہے فصاحت جو مصاحب تو بلاغت کا ندیم
نخب ہیں جو مضامین تو معانی میں لطیف
اہل دفتر نے جو کی کھول کے بستوں خوش
کبھی منصب کبھی تقسیم میں دیں جاگیریں
وقت دربار ہوا - مجمع ہوئے مجرا فی
سامنے آنے لگے خیر طلب بہر سلام
رو برو خسر و جم جاہ فلک فر کے نگاہ
ہوئی مجھ سے بخوبی جو فراغت حاصل
رو برو دستخط خاص کو لایا کاغذ
عرضیاں گزریں خلائق کے برائے مطلب
بعد اخبار کے پوچوں کی جو نوبت آئی
کہ ملازم ہیں جو مکر کار کے یہ دانش وقہم
بحث اک بات کی دونوں میں پڑی ہے ایسی

دارے طبل کی صورت میں الف مثل علم
یہی شکریہ ہے یہی فوج یہی ثقل و خدم
وزرا مرتبہ و دیدہ و جاہ و چشم
میں وہی گنج و خزانہ وہی دھار و دم
گردن نشی گردوں ہوئی تسلیم کو خم
شقے کھٹے گئے ہونے لگے فرمان رقم
عقل و فہم و خرد و ہوش و تدابیر و حکم
مرد با تھا جو ادب کا - وہ بچا را پیہم
تا ابد سلطنت پشت و پناہ عالم
مسند حکم ہوئی مطلع انوارِ قدیم
حکمت الدولہ - جو تھا نشی یا قوت رقم
لب ہوئے صل فتاں کھل گئے ابواب کرم
نئے مضمون کا اک پرچہ ہوا پیش اس دم
در دولت پہ ہے ہنگامہ - لڑے ہیں باجم
کہ ہم گتھ گئے ہیں صورت خط تو اقم

حکیم عالی یہ ہوا۔ جلد کرو حاضر بزم
حاضر بزم ہوئے وہ۔ تو ہوا یہ ایسا
عرض دانش نے یہی۔ روزا بد تک قائم
بندہ خاص نے دیکھے ہیں ہزاروں انسان
ایک حاکم ہے۔ فلک جاہ۔ خرمند۔ ذکی
نام ہے کلب علی خاں بہادر جم جاہ
علم میں۔ حلم میں۔ جو دو کرم و ہمت میں
جس میں جو بات ہو۔ کیونکر لے کوئی نہ کہے
میرے کہنے کو ذرا وہم نے باور نہ کیا
کہ کمالات کا حصر ایک میں ہے ناممکن
کیسے کیسے نہیں گزے ہیں جہاں میں نی
سائے عالم میں ہے سبیاں کی فصاحت و شور
کس کو معلوم فلاحوں کی نہیں ہے حکمت
چار سو ہمت حاتم کا ہے آواز بلند
تو جو کہتا ہے کہ ان سے ہے بڑھ کر کوئی
میں یہ کہتا ہوں میں دعویٰ میں ہوں اپنے مافی
کچھ یہ سنتا نہیں انکار یہ بانجی ہے کمر

دیکھیں کیا کہتے ہیں؟ خود دونوں میں ہم
کیوں لڑے؟ کیا سبب جنگ ہے آگاہ ہوں
یہ حکومت۔ یہ ایالت۔ یہ شہامت یہ حشم
حکمرانان زمانہ رؤسائے عالم
صاحب علم و ہنر۔ معدن اخلاق و کرم
جس کے خدام ہیں ہم مرتبہ قیصر و جم
ہے وہ یکتاے زمانہ میرا قدس کی قسم
پیش انصاف گزریں حق کا چچا لہو و ستم
بلکہ مارا رہ انکار میں منکر نے قدم
کار خانہ ہے خدا کا۔ نہیں خالی عالم
خواجگان عربستان و صنادید عجم
سائے آفاق ہیں کمری کی عدالت ہے علم
حکمراندار ہے عیاں۔ جلوہ فاعشرت جم
شش جہت پر ہے عیاں۔ سب سے جری تھا رتم
زعم باطل ہے فقط مانتے ہیں کب لے ہم
ہیں دلائل۔ جو ہوں گوش شنوا گوش صم
گفتگو سے طرفین آپ نہیں ہو کے بہم

ہو گیا حکم۔ کہ ہاں محکمہ بحث ہو گرم

ایک ایک بات کا ہو فیصلہ لا ہو کہ نعم

(۳)

فصل گل آبی چو گلزارِ جنت بوستاں
 ہر طرف گھلایا سرنگارنگ گلشن میں کھلے
 خم نہیں شاخیں دشتوں کی ہواستے خاک پر
 تم باذن اللہ کتنی آبی گلشن میں بہار
 جھوم کر آیا ہے ابر کو ہساری باغ میں
 لالہ کتا ہے کہاں ہوئی ہیں! اگر دیکھ لیں
 جھومناستوں کی صورت ہے دشتوں کا بجا
 لالہ احمد نے یا قوتی کی ڈبیا کی درست
 دار بست تاک میں خوشے نظر آنے لگے
 سیم غنچہ کیوں نہ بچد پوزیر گل بے شمار
 ہر روش پریشی ہے بزاز بن کر محرمی
 فیض شبنم نے دیے انجار کو آبی بداس
 نوعر دھان چمن کو ہے جو اہر کا جو شوق
 یوں ہے جنبش میں ہواستے ہر نہال ہلایا دار
 ہے مبارک فال۔ کوئی ہونے والی ہے خوشی
 جان بھولوں میں پڑی۔ زندہ ہوئی خاکِ چمن
 قمریوں کا قول ہے ہم میں میوہِ بارغِ خلعت
 صحنِ گلشن میں نہ اکنت نے جلیا ہے ہر رنگ

بڑا ہو سکے رشوان سب سے بل و فلفل باغِ انبیاں
 شیشہ برتج عید کیا ہوں سیناں یہاں
 کر رہی ہیں سجدہ شکر خداست اس جہاں
 جی اٹھے جو ہو گئے تھے مرد و دل وقتِ خزاں
 رقص میں ہیں ہر طرف طوائف بچ کر شادمان
 صاف جلوہ ہے چراغِ ظلم کا بھرتے عیاں
 اکنت گل میں ہی ہے کیفِ نہالِ رعناں
 شرکس شہلائے دکنی کے فروشی کی دکان
 جس طرح بھر مٹ ستاروں کا فراز آسمان
 رکھتی ہے اکسیری بونی بہار بوستاں
 جس طرف دیکھو گلی ہے بے غفل کی دکان
 بریں ہے مردم گھیا کے جامہ آبی دواں
 بیچنے فیروزہ آیا ہے چمن میں آسمان
 ہو خرواں جس طرح کوئی حسین دامن کشاں
 ہر چرخ لالہ جو ش رنگت ہے گلِ رفاں
 ہے دم جاں غش عیسیٰ یا نسیم بوسل
 سرو کتا ہے۔ کیتیں ہوں طوبی بارغ چناں
 مرغ بوکا آشیان ہے شاخ گلبن بکپاں

ہے محیط مشرق و مغرب بزرگ کمکشاں
بھول جائے ہر جنبش مثل شطرب آسماں
چادر مہتاب ہے فرشِ رضا کے بوستاں
ایسے خوشگین سنبل بسکہ ہے عنبر فشاں
خواب میں کر لے سبز سیر گلزارِ جاناں
خوک کی لیتے ہیں کانٹے یا چھو تپیں بناں

ہے بلندی و درازی اس قدر ہر شاخ میں
پائے گرسوئے نگہی کے مایہ میں تھوڑی جگہ
چودھویں کا چاند ہے جو چاندنی کا بھول ہے
سیر کو جو آئے۔ اس کا ناف آہو ہوشام
دیدہ بیدار نرگس کا تو کیا مذکور ہے
ہے بزمِ غنچہ گل کا کہ تیغ آبدار

ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب شمس العلماء ایل ایل ڈی (اڈنبرا)

اگر اس میں شک نہیں جلسہ ہے ایک بے جگم
کچھ ایسا گیارہ ہے نظم لیبالی و ایام
دباے کر دیا گویا کہ اس کا کام تمام
وہ کہ ہے ہیں پے بھائیں بجائیں اول شام
تو دونوں ہاتھوں سے لیتے ہیں ہم کلیجہ تمام
خدا ہی جانے ہوئے بچے کس قدر کہ تمام
کوئی سلون کو بھاگا۔ کوئی گیا آسام
کیس جہان میں جس دم قضا بھلے دام
تپ آئی صبح کو۔ دن چڑھتے ہو گیا سہام
کہ تپ کے ساتھ ہی آیا تھا مرگ کا پیغام
یہ کیا غضب ہے! ہوئی طب رہی ہی پیغام
بتائیں جتنی تدابیر۔ سب رہیں ناکام

اگرچہ دیر سے ہیں مجتمع خواص و عوام
کسی طرف سے بھی آوازِ خوش نہیں آتی
وہ بھی۔ کہ جو تھا مرکز تجارت ہند
مقام۔ ست جگہ رہتے تھے جن میں لاری رہا
حکایتیں جو مصائب کی بان کے منتظر ہیں
خدا ہی جانے ہوئیں کتنی عورتیں بوجہ
جلا وطن ہوئے کہتے کہ جہنم ٹھہر سکے
مگر پناہ نہیں آہوے حرم کو بھی
مرا تو کرتے ہیں لیکن نہ یوں مفاہات
ہوئی دوپہر۔ تو دنیا سے ہو گئے رخصت
ہزاروں آدمی گریباں بچ ہوئے تو ہوئے
علاج جتنے کیے۔ سب کے سب گئے بے سود

بس اب کھلا۔ کہ طبابت کی اتنی ہستی ہے
 سبکچین کو فسر مایا قاطع صفرا
 بنی جب ان کے جانوں پہ اور رہے جان
 دوا کا حیلہ ہے۔ مگر وقت ابھی نہیں آیا
 اور ان پہونچا ہے وعدہ۔ تو بس سمجھ رکھو
 ادھر دبا نہیں۔ پر قسط اور گرائی سے
 غلط۔ کہ عید ہوئی۔ کوئی ہم کو سمجھا دے
 ہمیں توبے زری و مغلسی نے مار دیا
 دیا و قسط سے باقی تھا کیا اجر نے میں
 کجا فراغ! خوشی کیسی یا کس کا المینان
 پھری ہوئی ہے خدا کی نظر کچھ ان دوز
 بساط یہ ہے۔ اور اس پر گناہ کی جرأت
 سو اسے توبہ نہیں کچھ علاج قہر خدا
 وہ چاہے مار دے ہم سب کو بے و باب قسط
 گناہ گار ہیں۔ پر معترف قصور کے ہیں
 جلیں۔ تو خوش جلیں۔ اور امن و عافیت چنگیں

کہ جھڑ سے لکھ یا خیساندہ از پرے ز کام
 مریض ہیں کو تہلایا روغن بادام
 تو ایسی طب کو سلام اور سلام آؤ سلام
 تو ہوتے دیکھا ہے چنگی سے خاک کی آرام
 دغا۔ دوا کوئی تدبیر بھی نہ آئے کام
 بچا ہوا ہے ہر اک گھر میں رات دن کلام
 یہ فاقے کیسے؟ اگر ہو چکا ہے ماہ صیام
 و گرنہ کیا تھا۔ جو ہوتے گرہ میں اپنی دہا
 مگر بھلے کو نگہبان خلق تھے حکام
 ان آفتوں کے سبب ہو رہی ہے ملت حرام
 کہ ہم نے توڑے ہیں اس کے ضوابط و احکام
 نمود یہ ہے۔ اور اس پر قصور کا اقدام
 طبیب ہو کہ طبابت۔ کسی پہ کیا الزام
 بقا تجھی کو ہے۔ اسے ذو الجلال والاکرام
 وسیع ہے تری رحمت۔ کریم ہے تیرا عام
 جب اسے موت۔ تو سب کا بخیر ہوا انجام

حکیم مومن خاں مومن

ملکت الموت ہے ہر ایک بشر
 چو ناک پڑتا ہے قفسہ محشر

کوئی اس دور میں بیجے کیونکر
 دادخواہوں کے شور سے دیکھو

آئینہ نے بھی اس زمانہ میں
 ہے پئے اشتیاق ویرانی
 نہ امیروں کو پائے بندہ عدل
 اس کو سورتہ زمان کا خطاب
 چمن آرا کو رسم پیرائش
 پا کے الزام دست خالی سے
 آب و نال کے لئے کرو رکھیں
 شعرا کو یہ آرزو سے شعر
 کام آئے نہ نغمہ شیرین
 سرور ان سپہر مرتبہ ہیں
 داغظوں کی زباں پہ آنا ہے
 کہے مفتی سوال کو واجب
 بھلے پھولے ہیں بے برد کیا دور!
 سختی و کاہلی کی دولت سے
 باندھتے ہیں سخن سرا موزوں
 قدر دانی کا نام ہی نہ رہا
 ایک امیر سخن شناس نہیں
 اے لب یا وہ گوے ہرزہ درکے
 ہجو گوئی نہیں ہمارا کام

تیغ کے سے نکالے ہیں جو ہر
 شاہ فرہاد دبے سستوں کشور
 نہ رعایا قطع و نسہ ماں بر
 جو کرے قتل خسرو سالہ پسر
 اک بہانہ ہے بسیر قطع شجر
 فلسفی پٹیتا ہے اپنا سر
 رستم ان زمانہ تیغ و سپہر
 خوان عیسیٰ ہے نیم خوردہ خر
 طوطیوں کو ہے حسرت شکوہ
 بسکہ جابل نواز دوں پرور
 بر ملا شکوہ قضا و قدر
 کسب مفقود جو ہوئے یکسر
 بیہر مجنوں بھی گرے آئے نثر
 دامن کوہ میں ہیں لعل و گہر
 کس طرح ہو نصیب سرو کو ہر
 چند ناداں ہوئے ہیں نام آور
 لاکھ ہیں شاعر ثنا گستر
 بس کہاں تک یہ ناستودہ نثر
 ایسی باتوں سے خاشی بہتر

مرزا اسد اللہ خان غالب

ہاں میرے نو! نہیں ہم اس کا نام
 دو دن آیا ہے تو نظر دم شمع
 بارے دو دن کہاں رہا غالب؟
 اڑ کے جاتا کہاں؟ کہ تاروں کا
 مرجاسے سرورِ خاصِ خواص
 غدر میں تین دن نہ آنے کے
 اُس کو بھولا نہ چاہیئے کہتا
 ایک میں کیا؟ کہ سب نے جان لیا
 رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے؟
 جانتا ہوں۔ کہ آج دُنیا میں
 میں نے مانا۔ کہ تو ہے حلقہٴ گوش
 جانتا ہوں۔ کہ جانتا ہے تو
 مہرِ تاباں کو ہو تو ہو۔ اے ماہ
 تجھ کو کیا پایہ روستناسی کا
 جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تو
 ماہِ مین سا ہوتا بن۔ میں کون
 میرا اپنا جدا معاملہ ہے
 ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص

میں کو تو جھک گئے کہ یہاں سلامت
 یہی انداز اور یہی اندام
 بندہ عاجز ہے۔ مگر دشمن آیا مر
 آسمان نے بھجوا رکھا تھکادام
 خیزا است نشاۃِ عامِ عوام
 لگے آیا ہے عید کا پیغام
 صبح جو جا بے اور آئے شام
 تیرا آغاز اور تیرا انجام
 تجھ کو سمجھتا ہے کیا کہیں نام
 ایک ہی ہے اُسید گاہِ انام
 غالب اُس کا مگر نہیں ہے غلام
 تب کہا ہے بطورِ استفہام
 قریب ہر روزہ بر سبیلِ دوام
 جز بتقریب عیدِ ماہِ صیام
 پھر بنا جاتا ہے ماہِ تمام
 تجھ کو کیا بانٹ دے گا تو انعام
 اوز کے لین دین سے کیا کام
 مگر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

کیا نہ دے گا مجھے مے گلغام
کر چکے قطع تیری تیزی گام
کوئے و مشکوے و صحن و منظر بام
اپنی صورت کا اک بلوریں جام
اسے پری چہرہ پیک تیز خرام
ہیں مہ و مہر و زبرہ و بہرام
نام شاہنشاہ بلند مقام
منظر ذوا لجلال والا کرام

جو کہ بختے گا بجلو فر فروغ
جب کہ چودہ منازل فلکی
تیرے پر تو سے ہوں فروغ پذیر
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز
کہہ چکا میں تو سب کچھ۔ اب تو کہہ
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
تو نہیں جانتا۔ تو مجھ سے سن
قبلہ چشم و دل بہادر شاہ

شیخ ابراہیم ذوق

نشہ علم میں سرست غرور و نخوت
تھا تصور میرا ہر امر میں تصدیق صفت
عقل کو تجزیہ کی اتنی ہوئی تھی کثرت
پر جتانی نہ تھی منظور مجھے علیت
درس و تدریس پہ آجاتی تھی بجلو غیبت
کبھی تھی تو میں ہر نحو مجھے محویت
کبھی میں کرتا تھا توضیح نجوم و ہیئت
کبھی کرنی تھی تطبیعی میں طبیعت جدوت
کبھی میں ناپتا تھا سطح زمیں کی سمت
کبھی مثبت مرے نزدیک زمیں کی حرکت

شب کو میں اپنے سر پر خواب راحت
منے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے
جو مسائل نظری تھے وہ پیری تھے تمام
ذہن میں سب مرے حاضر صور علیہ
چار و ناچار جو ترغیب و یاروں کے کبھی
کبھی تہمت تھی مری قاعدہ صرف میں صرف
کبھی نہیں کرتا تھا تصریح معانی و بیباں
کبھی تھا علم آسمانی کی طرف ذہن رسا
کبھی تھی عرضہ مدور فلک کی منہ سیر
کبھی ثابت مرے نزدیک فلک کی گردش

کبھی منقول پہ بائل کبھی سوئے معقول
 کبھی میں کرتا تھا قانون سے تشریح علاج
 کبھی میں نون سے بیندہ بیمار و صحیح
 کہ نباتات کی آگاہ میں کیفیت سے
 جوں نہندس کبھی مالوت پہ کل و مقدار
 کبھی کرتا تھا قرآن مہ و زہر وہ پہ نظر
 کبھی تھا علم و قیاد میں یہ اور اک منہ
 کبھی میں شاعر عرف ادب دان و بلغ
 کبھی کرتا تھا عروضی کا بھی میں قافیہ تنگ
 کبھی پیش نظر انجیل و زبور و تورات
 کبھی یہ آگہی شاستر و بید و پیران
 آخرش دیکھا۔ تو اُلعلم حجاب الاکبر
 قائمہ کیا کہ جو ہر علم کی جانی تعریف
 بے مقدار نہ پڑے صورت بہود و نظر

کبھی میں فقہ پہ راغب کبھی سوئے حکمت
 کبھی میں کرتا تھا قاموس میں تصحیح لغت
 کبھی میں نبض سے دانندہ ضعف و قوت
 کہ جمادات کی معلوم مجھے خاصیت
 جوں بحساب کبھی مصروف بغرب و نیست
 کبھی تھا دیکھتا مریخ و زحل کی رحبت
 ایک صورت سے ہماں کرتا تھا میں سمیرت
 نظم میں نام مرا نثر میں میری شہرت
 طبع موزوں کی دکھاتا تھا جو موز و نیت
 کبھی مصحف میں نظم میری سیر ہر آیت
 کروں اک بات سے بندت کی کھائیں کھنت
 عاقبت پایا۔ تو ہاں بلکہ کو اہل جنت
 قائمہ کیا ؟ جو ہوئی آگہی ہر ملت
 دور آئینہ دل سے نہ ہو زنگ و کلفت

(۲)

وہاں کیا معتدل ہے بلع عالم کی ہوا
 بحر نی ہے کیا کیا سیاحی کا دم با و ہار
 ہے گلوں کے حق میں شبنم مرہم زخم جگر
 ہو گیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق

مثل نبض صاحب محبت ہے ہر موج صبا
 بتگیا گھزار یہ عالم رشک صد دراز اشفا
 شلخ پشکتہ کو ہے باراں کا قطرہ مویا
 لالہ ہے دلخ سیہ پانے لگا نشو و نما

ہو گیا زائل مزاج دہر سے یا تلک جنوں
 ہوتا ہے لطف ہوا سے اس قدر پیدا ہو
 پانی یہ اصلاح صغے نے کہ دنیا میں کہیں
 ہر مزاج بطنی میں ہوتی ہے تولیدِ غول
 نام کو اشیا میں نے تلخی رہی نے سمیت
 کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے زُوم
 نیش کی جانوش ہو دنیا نہ زنبور میں
 راحت و آرام کا اس دور میں ہے دورِ دکھ
 موتا بند آنکھ میں اپنی جو کھتی تھی صدف
 آگیا اصلاح پر ایسا زمانہ کا مزاج
 نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ہوا الشافی طبیب
 فرق چاہا یا تلک اعضاء بدن سے درکار
 لاغروں کو ہو کمال تاہم طاقتِ پنجاب
 صبح صادق کے ہے گو مسر میں پیدا ہو گئی
 بھوک کی شدت سے اس کو اک نفسِ فرصت ہو
 رات بھر ٹھنسا کیا انجم کے تاسے چرخِ پیر
 پہونچی یہ تفتیح کی نوبت کہ نوبتِ خاد میں
 پوست پھولا ہے خوشی سے نفع کا کیا دخل ہے
 ہضم کا مل اس قدر عمدہ نے ہو نچا یا ہضم

بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی تپا
 برگ میں ہر نخل کے سرخی ہے جوں برگِ خا
 زر و چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہ رہا
 چاندنی کا چھول ہو گر ارغوانی ہے بجا
 بنگلی ریاک افیوں زہر مٹھا ہو گیا
 نیش کی جانوش حنظل دیوے شربتِ کامرا
 کام میں افی کے ہو مہرہ بجائے آبلہ
 چاہیے واقف نہ ہو دورانِ حیرتِ آسیا
 اب رکھے ہے روشنی مثلِ دلِ اہلِ صفا
 تازہ بانِ خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا
 کہتا ہے بیمار بس کر عجک ہے باکل شفا
 درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں جُدا
 کیسے دو ہفتے ہلا انک شب میں ہوید رائے شجا
 میکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی شہا
 قرص سے خورشید کے جب تک نہ کہے ہنسا
 پھر جو دیکھا صبح کو۔ اصلاحِ شکم میں کچھ تھا
 لیتی ہے جی کھول کر کیا کیا دکھائیں کزنا
 جوں حباب اسکے نہیں مطلقِ شکم میں ارتلا
 جید الکیموس ہے جو خلق سے اتری غدا

<p>ہے مزاج اہل عالم یہ قریبِ عدا رکھے گا تویہ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس دیکھا تو اس اپنے بال پر سے سائے نقش دھو</p>	<p>ساتوں اقلیمیں ہیں گویا اب بختِ استوا باغِ عالم میں ہی عالم جو صحت کا رہا پھینک دیگی تو گر گنڈا گلے سے قاتلا</p>
(رس)	
<p>پاے نہ ایسا ایک بھی دن خوشتر آسمان ہے بادۂ نشاط و طرب سے لبالب آج دیکھے نہ اس طرح کا تماشا جہان میں اتر رہا ہے عطر سے عیش و نشاط کے افراط انبساط سے ہے کیا عجب۔ اگر شادی کی اس کی دھوم ہے آج آسمان تک فرزندِ شاہ یعنی جو اں بختِ ذی وقار ہے اُس کی بارگاہ میں مانندِ چو بیار اس بیاہ کی نوید سے ہے اس قدر پھر تا ہے اتہام میں شادی کے رات دن فردِ حساب صرف سے اس بیاہ کی ہو کم</p>	<p>کھائے اگر ہزار برس چلے آسمان اک ستر سے بڑا تھا تھی ساغر آسمان گر ہو تمام چشمِ تماشا گر آسمان سچ ہے زمیں پہ پاؤں رکھے کیونکر آسمان مثلِ حبابِ جامے سے ہو باہر آسمان تارِ زمانہ جس کا ہے فرماں پر آسمان تسلیم کو ہے جس کے جھکا تا سر آسمان حاضرِ عصائے کائنات لے کر آسمان ہے پیرِ پوچھو انوں سے ہے بتا کر آسمان مقدور کیا باک ٹھہر سکے دم بھر آسمان گو لاکھ جمع و خرچ کا ہو دفتر آسمان</p>
خواجہ الطاف حسین حالی	
<p>ہے عید یہ کس جشن کی یا رب کہ سر اسر یہ عہد کہ گزرنے ہیں برس جس کو چانس لب وہ دور تعصب تھا۔ یہ ہے دورۂ اخلاق</p>	<p>ہے جو بلی ہے جو بلی اک لک کی زبان پر ست جگ سے ہے یہ ہند کے جن میں کہیں تیر وہ جنگ کا موجد تھا۔ یہ ہے صلح کا رہبر</p>

اس دورِ خجستہ میں وہ سب بچے گئے شعلہ
 اس عہد نے وہ خون بھرے ہاتھ کیے قطع
 بیٹوں کی طرح چاہتے ہیں بیٹیوں کو اب
 جب بیٹیوں نے زندگی اس طرح سے پائی
 اس عہد کے آگے غلاموں کی حمایت
 دی اس نے مٹا ہند سے یوں ہمستی کی
 نابود کیا اس نے زمانہ سے ٹھکی کو
 اس عہد میں انساں ہی نہیں ظلم محفوظ
 اسے نازش برطانیہ۔ اسے فخرِ برنرک
 سچ یہ ہے کہ فاتح کوئی تھجہ سانیس گڈا
 تسخیر فقط انگلوں نے عالم کو کیا تھا
 بند اپنے فرائض میں سماں میں بند
 بجتا ہے فقط چرچ میں اتوار کو گھنٹا
 گوشتِ قیصر سے ہے ہر قوم گراں بار
 اب ہند میں کشمیر سے تار اس کماری
 اُمتِ نہیں ہند کے راحت طلبوں کو
 گر برکتیں اس عہد کی سب کیجیے تحریک
 ہے اب یہ دعا حق سے کہ آفاق میں جب تک
 قیصر کے گھرانے پر رہے سایہ یزداں

تھی جن کی جہاں سوزِ کپٹ آگ سے بڑھ کر
 جو پھیرتے تھے بیٹیوں کے حلقِ پنجر
 جو لوگ ردوار کھتے تھے خونِ ریزی خوشتر
 دی زندگی اک اور انھیں علم پڑھا کر
 انساں کو نہ سمجھا کسی انسان سے کتر
 گویا وہ سستی ہو گئی خود عہدِ کہن پر
 اک تہ تھا اسد کا جو نوعِ بشر پر
 مظلوم نہ اب بیل۔ نہ گھوڑا ہے پیچھے
 لے ہند کے گلہ کی شاں۔ ہند کی قیصر
 محمود نہ تیمور مہنیل نہ سکندر
 اور تو نے کیا ہے دلِ عالم کو مسخر
 معمر مساجد ہیں۔ تو آباد ہیں مندر
 سکھ اور اذال گو بجتے ہیں روزِ برابر
 احساں مگر اسلام پہ ہیں اس کے گلائ
 ہر قوم کے ہیں پیرو جاں متفق اس پر
 راحت کی کسی سایہ میں جُز سایہ قیصر
 کافی ہے نہ وقت اُس کے لئے اور نہ دتر
 آزادی و انصاف حکومت کے ہیں ہم
 اور ہند کی نسلوں پر رہے سایہ قیصر

قطعات

خواجہ الطاف حسین حالی
(۱) بے تمیزی اپنا سے زماں

ہے وجود اسے بتل دیا برابر اور عدم
تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نگہ ہونے کا غم
استحسان کے وقت کھل جاتا ہے سب تیرے لئے
وگو کہ ہے رتبہ ترا نجد سے بڑا اے محترم
ہیں مجھ پر ایسے اس بازارِ ناپرساں میں کم
تجھ سے لے اماں لکین! تجھے پڑ رہتے ہیں ہم

از روہِ فقر آگینہ سے یہ میرے سے کہا
جنس تیری کس نہیں اور قدر قیمت تیری بیچ
دے کے دھوکا تو اگر الماس بجلے تو کیا
شکر اگر آگینہ نے یہ میرے سے کہا
مجھ میں اور تجھ میں مگر کر سکتے ہیں جو امتیاز
تیرے جو ہر گونہ میں موجود اپنی ذات میں

(۲) جس قوم میں افلاس ہو اُس میں بخل اتنا بننا نہیں جتنا اسراف

جب کوئے ہو تم کرنے ہو شرف کی مذمت
جب کرتے تھے کوئے تھے بخیلوں کو ملامت
ہے جس سے کہ انسان کو باطلی حاکموت
یا روں کے لئے ہے یہ بیاں موجبِ رقت
جب قوم میں افراط سے تھی دولت و ثروت
پھر اُس میں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
گھر گھر یہ ہے چھایا ہوا افلاس و فلاکت

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب
لیکن بخلاف آپ کے سبب اگلے سخور
اسراف بھی مذموم ہے بخل سے کمتر
حالی نے کہا روئے نہ پوچھو سبب اس کا
کہتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اس وقت
وہ جلتے تھے قوم جو جس وقت تو انگر
اور اب کہ نہ دولت ہے نہ ثروت نہ آقا

ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی پرواز کی ہے چوٹیوں کو جیسے ہدایت

(۳) بے اعتدالی

تم اے خود پرستو! طبیعت کے بندو
نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت
جو بھرے میں بیٹھو۔ تو اٹھو نہ جب تک
اگر پل پڑے جو سر اور گنجد پر
پڑا مرغ یا زنی کا لپکا۔ تو جانو
چوہا بھوت عشق و جوانی کا سر پر
جو ہے تم کو کھانے کا چپکا۔ تو سمجھو
جو پیٹے پہ آؤ۔ تو پی جاؤ اتنی
جو کھانا تو بچید۔ جو پینا تو آت گت

ذرا وصف اپنے سونوکان دھر کے
جدھر ڈھل گئے۔ ہو رہے بس اُدھر کے
تو بیچ اٹھے دو دین میں ہمسائے گھر کے
کہ اٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
تو فرصت ملے شاید اب تم کو مڑ کے
کہ بس ٹھن گئے غزم جنگِ ستر کے
تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
کہ چھوڑ گئے اب آپ دو رخ کو بھر کے
بہیں پاؤں کے ہوش جس میں سر کے
غرض یہ کہ سرکار ہیں پیٹ بھر کے

مرزا اسد خاں غالب

(۱)

اس شہنشاہِ فلکِ منظرِ بے مثل و نظیر
پاؤں سے تیرے لئے فرقِ اراستہ اور گ
تیرا اندازِ سخن شائے زلفِ اہام
تجھ سے عالم پہ کھلارا بطنِ قربِ کلیم
یہ سخن اوجِ دو مرتبہ معنی و مفہ

اے چاندِ اکرم شیوہ بے شبہ و عدیل
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت کلیل
تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے دنیا میں بچھا ماندہ بدلِ خلیل
بکرہ مرغِ ناصیہ قلزم و ذلیل

تا ترے عہد میں ہو بچ و اہل کی تکفیل زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرا تا حویل تیرا بختش مرے انجلا ح مقاصد کی کفیل تیرا اندازہ تغافل مرے مرنے کی دلیل چرخ کجیا ز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل پلے ٹھونکی ہے بن ناخن تدبیر میں کفیل کشش دم نہیں بے ضابطہ جہ تکفیل کلاک میری رقم آسوز عبارت کفیل میرے اجمال سے کرتی ہے تراویں تفصیل جمع ہوئی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل کعبہ امن و امان عقدہ کشائی میں یہ تحصیل	تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر ماہ نے چھوڑ دیا گھر سے جانا یا ہر تیری دانش مری اصلاح مقاصد کی تفریر تیرا اقبال ترحم مرے جینے کی نوید بخت ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو امان تیجھے ڈالی ہے سر رشته اوقات میں غفلت تبش دل نہیں بے رابطہ خوفِ عظیم فکر میری گہرا اندوہ اشارات کو شیر سیرے ابہام پہنچتی ہے تصدیق توضیح نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف قلہ کون و مکان خستہ نوازی میں یہ پیر
--	--

(۲)

ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت تو واکرے اس عقدہ کو سو بھی باشارت گر لب کو نہ دے چہڑیہ جواں سے طہارت ہے فخر سلیمان جو کرے تیری وزارت ہے داغِ غلامی ترا توجیع امارت تو آگ سے گروغ کہتے تاب نذرارت باقی نہ رہے آتش سوزاں میں حرارت	اے شاہِ جاگیر جہاں بخش - جاندار جو عقدہ دشوار کہ کو شمش سے نہ واپار مکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر آصف کو سیما کی وزارت بے شرف تھا ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ اتھی تو آب سے گریب کرے طاقتِ سیلاں ڈھونڈے نہ ملے موج دریا میں دولانی
---	---

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرنی میں تو غل
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر!
نوروز ہے آج - اور وہ دن ہے کہ ہونے لیں
جگو مشرف مہر جانتا اب مبارک

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرنی میں تو غل
کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر!
نوروز ہے آج - اور وہ دن ہے کہ ہونے لیں
جگو مشرف مہر جانتا اب مبارک

شیخ ابراہیم ذوق

(۱)

آج ہے ٹپل تصویر تلک زم زم مسخ
زر گل پیک صبا پائے نہ کیونکر پارِ سخن
تن پیران کمن سال پہر چین شکنج
آگے بہت کے تری گوہر شوار کے گنج
دستِ عالم میں بجای ہے کہ جو دین تیغ و تیغ
قفلے کوٹھنے میں جوں نرد ہے کیا کیش تیغ
ایک سے ایک موافق - کہ مرخان و مرج
صفہ تقویم کا گویا ہے بشاطِ شطرنج
ذوق جو مدح و ثنائیں ہے تری گنج
رنگ نوروز جو ہے اب کے برنگِ نابین

خسرو! اس کے تراخِ دہ جشن نوروز
خبرِ عیش تری دے ہے جن کو جا کر
بادہ جوشِ جوانی کی ہے گویا اک موج
چند قطرے سے ہیں شبنم کے وہ بلا کہ تر
حُسنِ نیت سے ہے تو یوسفِ مخمر شش
شش جہت پر ہے جو غالب تر اس پر چین
نہ تجھے اب سے آتش - نہ خن آتش سے جلے
تیرے منصوبے کے تابع ہیں سب احکامِ خم
لایا ہے معنی رنگیں سے یہ لعلِ خوش رنگ
خسرو! ہوتا ہے اس رنگ سے معلوم پیکر

بزم رنگیں میں تری رنگِ طرب ہو ہر روز
اور تری خاطرِ اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

مستدسات

میر بر علی انیس

میر بر علی نام - انیس تخلص - میر حسن دہلوی کے نامور پوتے - لکھنؤ میں تعلیم و تربیت پائی مرقیہ گوئی و مرقیہ خوانی ان کی چار دہائی میں مشہور و مسلم تھی - فصاحت بیان اور لطافت محاورہ میں ان کا کلام اس پایہ بلند پر پہنچا ہے کہ جس کی نظیر نہیں ہے

صفت صحیح

طے کر چکا جو منزلِ شب - کارِ دانِ صبح
گھرِ دل سے کوچ کرنے لگے اخترِ انِ صبح

پنہاں نظر سے روئے شب تار ہو گیا
عالمِ تمام مطلعِ انوار ہو گیا

بیل گلشنِ فلک سے تارے ہوئے رواں
آئی بہار میں گل و مناسیب پر خزاں

دیکھ لائے طورِ بادِ سحر نے سحوم کے
چترِ مُردہ ہو کے رہ گئے غنچےِ نجوم کے

چھپنا وہ ماہتاب کا - وہ مہج کا ظہور
وہ رونق اور وہ سرِ ہوا - وہ نضا - وہ نور

انساں زمیں پہ عو - ملک آسمان پر
جاری تھا ذکرِ قدرت حق بہ زبان پر

وہ مرنے کی شفق کی ادھر چنچ پر بہار
وہ بار و درخت - وہ صحرا - وہ سبز و زار

شبنم کے وہ گلوں پہ گہرائے آبدار	بچوں سے سب بھرا ہوا دامن کھسا
ناتے کھلے ہوتے وہ گلوں کی شبنم کے	آتے تھے سرد سرد وہ جھوٹے نسیم کے
غریب الوطنی	
ہوتے ہیں بہت بچ مسافر کو سفر میں	راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
سوشل ہوں پردھیاں لگا رہتا ہے گھر میں	پھرتی ہے سدا شکل عزمیوں کی نظریں
سنگ غم فرقت دل نازک پہ گراں ہے	اندوہ غریب الوطنی کا ہش جاں ہے
گوراہ میں ہمراہ بھی ہو را حلہ و زاد	جالی تہیں انسو کی خاطر ناشاد
جب عالم تنہائی میں آتا ہے وطن یاد	ہر گام پہ دل مثل جرس کرتا ہے فریاد
اک آن غم و بچ سے فرصت نہیں ہوتی	منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ہوتی
ہمراہ سفر میں ہوں اگر حامی و ناصر	منزل پہ مگر کھول کے سوتے ہیں مسافر
جب ہو سفر خوف و پریشانی خاطر	شب جاگتے ہی جاگتے ہو جاتی ہے آخر
ہر طرح مسافر کے لئے رنج و تعب ہے	رہ جائے پس قافلہ تنگ کر تو غضب ہے
لکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چلے	منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
پاتھروں سے اگر پیچھے کے کانٹوں کو ٹکائے	ڈرے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے
دامادوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی	تھک کر بھی جو بیٹھے تو اٹھتا نہیں کوئی

صفت تیغ

تھا صورت آئینہ تمام اس کا بدن صاف	خوں پتی تھی۔ پردہ کھو تو منہ صاف بہ صاف
چلتی تھی چو سن سن۔ یہ نکلتا تھا سخن صاف	ہوں میں تودہ چاروب۔ کہ کردیتی ہوں صاف
تا اہل ہیں۔ نامزد ہیں ناپاک ہیں اعدا	میں برقی غضب ہوں حسن و خاشاک ہیں اعدا
منہ سے چھلم کاٹ کے گردن میں در آئی	گردن سے سر نکلتا تھا کہ چو سن میں در آئی
چو سن سے گزرتا تھا کہ بہن تن میں در آئی	تن سے ابھی اتری تھی کہ تو سن میں در آئی
بچتا کوئی کیا تیغ قضا رنگ کے نیچے	اک برقی غضب کو نگئی تنگ کے نیچے
پیری کبھی۔ کہ خوں میں ہنا کر نکل آئی	ٹھہری کبھی غوطہ کبھی کھا کر نکل آئی
کاٹی جو زہر۔ موج میں جا کر نکل آئی	منہ دھار سے دو ہاتھ لگا کر نکل آئی
کیا ڈر اسے طوفان کا۔ چو چالاک ہوا ایسا	جب باڑھ پہ دریا ہو۔ تو پیر اک ہوا ایسا
دم بھر نہ ٹھہرتی تھی عجیب طرح کا دم تھا	تیزی پہ جیسے ناز تھا۔ سر اس کا قلم تھا
تا گن میں نہ نہ رہر نہ انفی میں یہ سم تھا	یہ فتح کی جو بات تھی۔ قدا سوا سٹے عم تھا
بد اصل تکبر کے سخن کہتے ہیں اکثر	جو صاحب جہر میں ٹھکے رہتے ہیں اکثر
(۲)	
بجلی سی جو گر کر صفت کفار سے نکلی	آہ از بن تیغ کی ٹھنکار سے نکلی

گہ ڈھال میں ڈوبی کبھی تلوار سے نکلی	در آئی جو بیکان میں - تو سوار سے نکلی
تھے بند خطا کاروں پہ درامن و اماں کے	چلے بھی چھپے جاتے تھے گوشوں میں کہاں کے
انلاک پہ چنگی کبھی - سر پر کبھی آئی	کو ندی کبھی جوشن پہ - سپر پر کبھی آئی
گہ پڑ گئی سینہ پہ - جگر پر کبھی آئی	تڑ پی کبھی ہیلو پہ - مکر پر کبھی آئی
ٹے کر کے پھری - کو نسا قصہ تھافرس کا	باقی تھا جو کچھ کاٹ - وہ حصہ تھافرس کا
بے پاؤں جدھر ہاتھ سے چلتی ہوئی آئی	اندی اُدھر آک خوں کی اُلتی ہوئی آئی
دم بھر میں وہ سورنگ بدلتی ہوئی آئی	پی پی کے لو - لعل اُگلتی ہوئی آئی
مہرا تھا بدن - رنگ زمر سے ہر اتھا	جو ہر جو کہو! پیٹ جو اہر سے بھرا تھا
سر چلے - تو موج اُس کی روانی کو نہ پہونچے	قلزم کا بھی دھارا ہو - تو بانی کو نہ پہونچے
بجلی کی تڑپ شعلہ نشانی کو نہ پہونچے	خجری زبان تیز زبانی کو نہ پہونچے
دونخ کے زبانوں سے بھی آج اس کی بُری تھی	بر بھی تھی رگڑاری تھی - سرور ہی تھی ٹھہری تھی
موجود بھی ہر غول میں اور سب جدا بھی	دم خم بھی - نگاؤں بھی صفائی بھی اد بھی
اک گھاٹ پہ تھی آگ بھی سپائی بھی جوابی	امرت بھی - ہلاہل بھی - سیجا بھی قضا بھی
کیا صاحب جو ہر تھی عجب طرف تھا اُس کا	موقع تھا جہاں جس کا - وہیں صرف تھا اُس کا

ہر ڈھال کے پھولوں کو اڑاتا تھا پھل اُس کا	تھا لشکرِ باغی میں ازل سے عمل اُس کا
ڈر جاتی تھی منہ دیکھ کے بزدل اجل اُس کا	تھا قلعہ چار آئینہ گویا جل اُس کا
اس در سے گئی۔ کھول کے وہ در بکل آئی	
اگہ صدر میں بیٹھی۔ کبھی باہر بکل آئی	
نیزوں پہ گئی بھٹیوں والوں کی طرف سے	جاہو نچی کماندوں پہ بجالوں کی طرف سے
بھر آئی سواروں کے رسالوں کی طرف سے	منہ تغیر کی جانب کیا دھالوں کی طرف سے
بس ہو گیا دفتر نظری نام و نسب کا	
لاکھوں تھے تو کیا! دیکھ لیا جائزہ سب کا	
پونجی جو سب تک۔ تو کلائی کو نہ چھوڑا	ہر ہاتھ میں ثابت کسی گھائی کو نہ چھوڑا
شوخی کو شیراز سے کہ۔ لڑائی کو نہ چھوڑا	تیزی کو روکھائی کو نہ صفائی کو نہ چھوڑا
1937	اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے
	قینچی سی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے
چار آئینہ والوں کو نہ تھا جنگ کا یارا	چو رنگ تھے سینے۔ تو کلیجہ تھا دو پارا
کہتے تھے زرہ پوش نہیں تاب خدا را	نچ جائیں تو جانیں کہ ملی جاں دو بار ا
جو شن کو مٹا تھا کہ حفاظت کا محل ہے	
اس کی نہ خبر تھی۔ کہ یہی دایم اجل ہے	
بدکیش بہ لڑائی کا چلن بھول گئے تھے	ناوک مکنی تیر مکن بھول گئے تھے
سب جگہ گری عہد مکن بھول گئے تھے	بیہوشی میں ترکش کے دہن بھول گئے تھے
معلوم نہ تھا جسم میں جان ہے کہ نہیں ہے	چلاتے تھے قبضہ میں کہاں ہے کل نہیں ہے

صفت ہے

لکھتا ہے ادہم قلم اب سرعت عقاب
بستی میں یل ہے تو بلندی میں ہے محاب
نعل اس کے ماہ نو ہیں۔ تو سم رشک غلاب
سرعت میں برق گرم دانی میں جو ہے آب

اڑنے میں اس فرس کو پرندوں پہ اوج ہے
اک شور تھا۔ قدم نہیں دریا کی موج ہے

نازک مزاج۔ نترن اندام تیز زو
اس کا نہ اک قدم نہ زغندیں بہن کی
گرد و بسیر۔ بادیہ پیا و برق دو
دو روز سے نہ کاہ ملی تھی اُسے۔ نہ بخو

رفا میں ہوا تھا۔ اشارے میں برق تھا
سرعت میں کچھ کمی تھی۔ نہ چھل بل میں فرق تھا

مڑ مڑ سے تند۔ بو سے شکر و۔ ہوا سے تیز
طاؤس و کبک و نسر و عقاب و ہما سے تیز
چالاک فہم و فکر سے۔ ذہن رسا سے تیز
جانے میں اُنکے ہر پڑ شہر سبا سے تیز

ذمی جاہ تھا۔ سعید تھا۔ فیروز بخت تھا
رہو ار کیا! ہوا پہ سلیمان کا تخت تھا

سمٹا۔ جا۔ اڑا۔ ادھر آیا۔ ادھر گیا
تیروں سے اُنکے۔ پر چھپوں میں بے خطر گیا
چمکا۔ پھرا۔ جمال دکھایا۔ ٹھہر گیا
برہم کیا صفوں کو۔ پروں سے گذر گیا

گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کی نگار تھا
ضربت تھی نعل کی۔ کہ سروہی کا دار تھا

(۲)

کو تاہ و گرد و صاف۔ کنوئی مگر کفل
کیا خوش تما کشادگی سینہ و نعل!

سیاب کی طرح نہیں آرام ایک پل	پھرتا تھا اس طرح کہ پھر جس طرح سے گل
اکب نے سانس لی کہ وہ کوسوں روانہ تھا	تار نفس بھی اس کے لیے تازیا نہ تھا
وہ جست و خیز و سرعت و جلال کی سمند	سلجے میں تھے ڈھلے ہوئے سب کے جوڑ ہیں
نیم قرص ہاتھاب سے روشن ہزار چند	نازک مزاج دشواری و سیم چشم و سر بلند
گر ہل گئی ہو اسے ذرا باگ۔ اڑ گیا	پتلی سوار کی نہ پھری تھی۔ کہ مڑ گیا
آہو کی جست۔ شیر کی آمد۔ پر سی کی چال	کبک درسی بھل۔ دل طاؤس بانال
سبز و شبک رومی میں قدم کے تلے نہال	اک دو قدم میں بھول گئے چو کر می خزال
جو آ گیا قدم کے تلے۔ گرد برد تھا	چھل بل غضب کی تھی کہ چھلا وہ بھی گرد تھا
بجلی کبھی بنا۔ کبھی رہو اربن گیا	آیا عرق۔ تو ابر گریہ بار بن گیا
گہ قطب۔ گاہ گنبد و دار بن گیا	نقطہ کبھی بنا۔ کبھی پرکار بن گیا
حیراں تھے اس کی گشت پہ لوگ امن مجوم کے	تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جنوم مجوم کے
یہ تیرے لیے آج بھی تھا نہ	
پیشہ پیر۔ رہے۔ یہ سادہ تو دیکر بخند ہیں	

ایک شمن

از مؤلف

کیفیت قلعہ اکبر آباد

یا رب! یہ کسی مشعل کشتہ کا ڈھواں ہے	یا گلشنِ برباد کی یہ فصلِ خزاں ہے
یا برہمیِ بزم کی فریاد و نغاں ہے	یا قافلہٴ رفته کا پسِ نیمہ رواں ہے
ہاں! دورِ گزشتہ کی جنابت کا نشان ہے	یا بی عمارت کا جلالِ اس سے عیاں ہے

اڑتا تھا یہاں پرچمِ جم جاہی اکبر	
بجتا تھا یہاں کوسِ شہنشاہی اکبر	

باہر سے نظر ڈالے اس قلعہ پیک چند	برپا ہے لبِ آبِ جن صورتِ الوند
گویا کہ ہے اک سوراخ مضبوطِ تنومند	یا مہند کا رجوت ہے۔ یا ترکِ سمرقند
کیا پارہ سنگین کا پناہ ہے قرا گند!	ریختی کا قرا گند یہ پاندھا ہے مکر بند

مسدود ہے خندق سے رو قنہ و آشوب	
اربابِ قزو کے لئے بوج ہیں سرِ کوب	

تعمیرِ در قلعہ بھی البتہ ہے موزوں	مڑ شوکت و ذی ثبآن ہے اس کا بیخِ بیلوں
کی ہے شعرا نے صفتِ طاقِ فریدوں	معلوم نہیں اس سے وہ کمتر تھا کہ افروں
گو ہمسرِ کیواں ہے نہ ہم پلہ گردوں	محراب کی مہیت سے ٹپکتا ہے یہ مضمون

<p>پیلان گراں سلسلہ باہو بیج زریں اس دور سے گزرتے تھے بعد رونق تھیں</p>		
<p>اکبر سا کبھی محزن تدبیر یہاں تھا یا شاہجہاں مرجع تو قیر یہاں تھا القصہ کبھی عالم تصویر یہاں تھا</p>	<p>یا طنطنہ دور جہانگیر یہاں تھا یا مجمع ذی رتبہ مشاہیر یہاں تھا دنیا سے ہوا جلوہ تقدیر یہاں تھا</p>	
<p>ہتا تھا اسی کا رخ میں دولت کا سمندر تھے جشن لوکاں اسی قصر کے اندر</p>		
<p>وہ قصر مٹے کہ جہاں عام تھا دربار وہ سقف زراں دوہے مانند چین زار اب بانگ لقیب اس میں نہ چائش کی لکڑ</p>	<p>آئینہ لمط صاف ہیں جس کے در دیوار وہ فرش ہے مرمک مگر چشمہ انوار سرمہ نگ کمر بستہ نہ وہ مجمع مختار</p>	
<p>کستا ہے کبھی مرکز اقبال تھائیں بھی ہاں! قبلہ غفلت و اجلال تھائیں بھی</p>		
<p>جب تک کہ شہیت کو مرا و قر تھا منظور شاہان معاصر کا معین تھا یہ دستور تا میری زیارت سے کریں حشم کو پُر نور</p>	<p>نافذ تھا زانہ میں مری جاہ کا منشور کرتے تھے سفیران ذوی القدر کو مامور آواز مری شان کا پہونچا تھا بہت دور</p>	
<p>آکٹاف جہاں میں تھا مرادید بہاری تسلیم کو تھکتے تھے یہاں ہفت ہزاری</p>		
<p>وہ چتر وہ وہیم وہ سامان کہاں ہیں؟ وہ بخشی و دستور وہ دیوان کہاں ہیں؟</p>	<p>وہ شاہ وہ نوین وہ خاقان کہاں ہیں؟ خدا ہم ادب اور وہ دربان کہاں ہیں؟</p>	

وہ دولتِ مغلیہ کے ارکان کہاں ہیں؟	فیضی و ابو الفضل سے انجمن کہاں ہیں؟
مستان ہے وہ شاہ نشین کن حصد افسوس ہوتے تھے جہاں خانِ مخواہین زمیں بوس	
وہ بارگہ خاص کی پاکیزہ عمارت بڑھتی تھی جہاں نظم و سیاست کی مہارت جوں شخصہ معزول بڑھی ہے وہ اکارت	تاباں تھے جہاں شیر شاہی و وزارت آتی تھی جہاں فتح ممالک کی بشارت سیلج کیا کرتے ہیں اب اس کی زیارت
کہتا ہے سخنِ فہم سے یوں کتبہ درڑوں کا ”تھا مخزنِ اسرار یہی تاجِ روضوں کا“	
اور نگِ یہ رنگ جو قائم ہے لپ باہا اشعار میں ثبت اس پہ جا نگہ کر ہے نام پر صاف نظر آتا ہے کچھ اور ہی انجام	بوسہ جسے دیتا تھا ہر اک زبدۂ عظام شاعر کا قلم اس کی بقا لکھتا ہے مادام سالم نہیں چھوڑے گی اسے گردشِ ایام
فرسودگی دہرے شق اب تو کیا ہے آئینہ کی نسلوں کو سبق خوب دیا ہے	
ہاں کس لیے خاموش ہے اوختِ جگریش؟ کلی ہے ترے دوش پہ کیوں صدمہ دریش؟ بو لاکہ زمانہ نے دیا نوش ۔ کبھی نیش	کس غم میں یہ پوش ہے کیا سوگ ہے دریش؟ جو گی ہے ترانچہ کہ صوفی ہے تراکیش؟ صدیاں مجھے گزری ہیں یہاں تین کم و بیش
صدے کبھی مجھ پر گھر و لعل ہوئے تھے شاہانِ معظم کے قدم میں نے چھوئے تھے	
زمینیں محل اور برجِ متمن کا وہ انداز	صنعت میں ہے بے مثل تو رفعت میں سرفراز

یاں مطرب خوش لہجہ کی تھی گونجتی آواز اب کون ہے؟ بتلائے جو کیفیت آغاز	گہ ہند کی دُھرت تھی کبھی نعمت شیراز زہنار! کوئی جاہ و حشم پر نہ کرے ناز
چن تاروں کے پرتو سے تھایہ بیرج منور اب اُن کا مقابلہ میں تہ خاک ہے بستر	
اُس عہد کا باقی کوئی سماں ہے نہ سبب وہ جام بلوریں ہیں۔ نہ وہ گوہر نایاب ہنگامہ جو گذرا ہے۔ سو افسانہ تھایا خواب	تو آسے شکستہ ہیں۔ تو سب حوض ہیں بے آب وہ چلمن زرتار۔ نہ وہ بستر کم خواب یہ معرض خُدام تھا۔ وہ موقوفِ حجاب
وہ ہزم نہ وہ دور۔ نہ وہ جام۔ نہ سانی ہاں! طاق درواق اور درو بام میں باقی	
مستور سر پر وہ سہمت میں تھے جو گل کچھ خیرِی فرغانہ تھے۔ کچھ لالہ کابل تعمیر کے انداز کو دیکھو بہ تامل	سو دودھ ترک اور مغل ہی سے نہ تھے گل پھر مولسری ہند کی اُن میں گئی بل بل گل تاتاری و ہندی ہے بہم شان و تجل
شیاح جانیدہ کے نزدیک یہ تعمیر اکبر کے خیالاتِ مرکب کی ہے تصویر	
درشن کے بھروبے کی پڑی تھی ہیں بنیاد زنجیرِ عدالت بھی ہوئی تھی ہیں ایجاد وہ فور جہاں اور جہانگیر کی افتاد	ہوتی تھی تولادان میں کیا کیا دہش و داد جو سیم شہنشاہ میں پہنچاتی تھی فریاد اس کلخ ہایوں کو تفصیل ہے سب یاد
ہر چند کہ بیکار یہ تعمیر پڑی ہے قد اُس کی مورخ کی نگاہوں میں بڑی ہے	

اب دیکھیے وہ مسجد و حمام زمانہ صنعت میں ہر اک چیز ہے کیا دیگانہ کیا ہو گئے وہ لوگ! کہاں ہے وہ زمانہ	وہ نہر۔ وہ حوض۔ اور وہ یانی کا خزانہ ہے طرز عمارت سے عیاں شاہ شہانہ ہر سنگ کے لب پر ہے غم اندوز ترانہ
جنتائے گلزار کی یہ فصل خزاں ہے ممتاز محل ہے نہ یہاں نور جاں ہے	
وہ قصر جہاں چو در پوری رہتی تھی بائی دیکھا اسے جا کر۔ تو بڑی گت نظر آئی گویا در و دیوار یہ دیتے ہیں ڈھائی	تھی دولت و نفرت نے جہاں دھوم بجائی صحفوں میں جی گھاس تو دیواروں پہ کائی ممکن نہیں طوفان حوادث سے بچائی
جس گھر میں تھے نسرین و سمن یا گل نلاد اب نسل ابابیل میں ہے اس کا قبالم	
وہ مسجد زیا۔ کہ ہے اس بزم کی دہن محراب و در و بام میں سب نور کا مسکن کافور کا تودہ ہے کہ الماس کا معدن	خوبی میں یگانہ ہے۔ ولے سادہ و مرقن موتی سے ہیں دالاں۔ تو ہے دو دما آئین یا فجر کا مطلع ہے۔ کہ خود روز ہے روشن
بلور کا ہے قاعدہ یا نور کا ہے راس باطل سی ہوئی جاتی ہے یاں قوت حساس	
ہاتھوں نے ہنرمند کے اک سحر کیا ہے یا تارِ نظر سے کہیں پتھر کو بسیا ہے نہ شمع۔ نہ فانوس۔ نہ بتی۔ نہ دیا ہے	ساچے میں عمارت کو گر ڈھال دیا ہے مَرَم میں مہ و مہر کا سانور و ضیا ہے ہاں چشمہ خورشید سے آبِ اُس نے پیلا ہے
چلیے جو یہاں سے تو نظر کتنی ہے فی القوہ	نظارہ کی دو کجوا اجازت کوئی مہم فوہ

مسجد نے اشارہ کیا پتھر کی زبانی کچھ شوکتِ ماضی کی کہی اُس نے کمانی ”اُن حجروں میں ہے شمع نہ اس حوضِ میرانی“	اس قلعہ میں ہوں شاہجاں کی پیش نشانی کچھ حالتِ موجودہ بایں سحرِ بیانی خواروں کے دل میں بھی ہے اک دردِ نہانی
---	--

تہیج - نہ تہلیل - نہ تکبیر داذاں ہے
بس گوشہٴ تنہائی ہے اور قفلِ گراں ہے

جگھٹ تھا کبھی یاں وزرا و امرا کا چرچا تھا شب و روز یہاں ذکرِ خدا کا اک قافلہٴ ٹھہرا تھا یہاں غز و علا کا	جمع تھا کبھی یاں صلحا و علما کا ہوتا تھا ادا خطبہ سدا حمد و ثنا کا جو کچھ تھا گذر جانے میں جھوٹکا تھا ہلکا
--	--

ہیں اب تو نازی مرے باقی ہی دو تین
یاد دھوپ ہے یا چاندنی یا سایہٴ مسکین

وہ دور ہے باقی نہ وہ ایام و یالی ہر کو شک و ایوان - ہر اک منزلِ عالی آقا نہ خداوند - اہالی - نہ موالی	جو واقعہٴ حسی تھا سو ہے آج خیالی عبرت سے ہے پُر اور کلینوں سے بھالی جز ذاتِ خدا کوئی نہ وارث ہے نہ ولی
---	--

یہ جملہ محلات - جو سنسان پڑے ہیں
پتھر کا کلیجہ کیے حیران کھڑے ہیں

جب گنبد ہوئی دولتِ مغلیہ کی تلوار تب ایک جو تھا لشکرِ گلشن کا سپہدار یہ بارہ و برج اور یہ ایوان - یہ دیوار	اور ٹوٹ لیا جاٹ سے ایوانِ طلا کا افواجِ خالف سے ہوا بر سرِ پیکار کچھ ٹوٹ گئے ضرب سے گولوں کی بہ ناچار
--	---

ہے گردِ دشِ ایام کے حملوں کی کستہ تاب

	پھر قلعہ اکبری میں کیا تھا پرستِ خواب :	
او پنا ہوا سرکار کے اقبال کا رایت آئنا قدیمہ کی لگی ہونے مریمت دیوار گری آج ۔ توکل بیٹھ گئی چھت		آخر کو مخالفت کی شکستہ ہوئی قوت نہرانے دگا پھر علم امن و حفاظت یہ بات نہ ہوئی ۔ تو پوچھتی وہی نوبت
	مُحْکَمِ زماں کی جو نہ ہوتی نگہ رانی رہ سکتی نہ محفوظ یہ مغلیہ نشانی	
اکبر کی بنا اس سے بھی پائندہ ہے اک اور ہر چند گزر جائیں بہت قرن بہت دور اس میں نہ خلل آئے کسی نوع کسی طور		اربابِ خرد چشمِ بعیرت سے کریں غور سروے کی جنا جس پہ نہ گرمی کا چلے غور برسوں پونیس پھرتے ہیں بچ محل و غور
	انجینیروں کی بھی مرمت سے بری ہے وہ حصن حصیں کیا ہے فقط ناموری ہے	
محتاج مرمت ہے ۔ نہ مسئلہ ہم ترمیمیں ہے تیری عبت کی بنا اراک و وزیر و مین زائل نہیں ہونے کی ترے عہد کی تمیں		او۔ لکیرِ ذیجاہ ! تری عزت و تمکین کندہ ہیں دلوں میں تری الفت کے فرمیں تو حلیہ بے سود کرے بھی کوئی کم ہیں
	نیشیوں سے رعایا میں یہ آئین وراثت قائمِ حلی آتی ہے ترے نام کی عظمت	
او پھونچ کا دورہ تری شہرت نے بھلایا کس سہمی کو ترے دورِ عدالت نے بھلایا پھلوں کو غرض تیری عنایت نے بھلایا		بلکرم کی سجا کو تری محبت نے بھلایا ارجن کو تری جرات و ہمت نے بھلایا اسکندر و رجم کو تری شوکت نے بھلایا

رُباعیات

خواجہ الطاف حسین حالی

(۱)

مہمان کوئی دین سکے ہیں دولت پہ کیا ل
اندیشہ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

چھوڑو کہیں جلد مال دولت کا خیال
سرمایہ کرو وہ جمع - جس کو نہ کبھی

(۲)

بدظن نہ ہو عیب پس ہیں اگر یوں دو چار
کر حسن و جمال کا نہ اُس کے انکار

موجود ہنر یوں ذات میں جس کی ہزار
طاؤس کے پائے زشت پر کر کے نظر

(۳)

ساتھی ہیں عزیز - لیک ذلت میں نہیں
جو نوع بشر کی خود جبلت میں نہیں

ہیں یار رفیق - پر مصیبت میں نہیں
اُس بات کی انساں سے توقع ہے بحث

(۴)

آتا نہیں فرق اس کے سوا اُن میں نظر
جاہل کو نہیں جل کی کچھ اپنے خیر

ہیں جل میں سب عالم و جاہل مہر
عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا

از مولف

(۱)

کچھ عجیب نہیں اگر چلو دھیمی چال
ہاں! راہ طلب میں شر ہے استقلال

یتیزی نہیں بنجراہ اوصاف کمال
خود گوش سے لے گیا ہے کچھ بازی

	(۲)	
یا بد نشی سے کچھ بُرائی کی ہے اپنے ہاتھوں نے جو کمائی کی ہے		گرنیک دلی سے کچھ بھلائی کی ہے اپنے ہی لیے ہے سب نہ اوروں کے لیے
	(۳)	
نیت ہی پر موقوف ہے نتیجہ عمل مہر کوڑ ہو کر رضا سے حق عزوجل		دین اور دنیا کا تفرقہ ہے محل دُنیا دار سی بھی عین دین داری ہے
	(۴)	
ڈھونڈھا۔ تو کہیں پتا نہ پایا ہرگز یہ خط نہ ہونے لگے خُدا یا ہرگز		دیکھا تو کہیں نظر نہ آیا ہرگز کھوٹا پاتا ہے سب فضولی اپنی
امیر سیانی		
	(۱)	
روتی ہے پٹ پٹ کے حسرت ہم سے یا گھر ہوتا ہے آج رخصت ہم سے		گھر کھدنے کی پوچھو نہ نصیبت ہم سے یا ہم جاتے تھے گھر سے رخصت ہو کر
	(۲)	
با لفرض۔ کہ آپ زندگی تم ہو میں نام نہ پیاس کا۔ جو پانی تم ہو		با لفرض حیات جاودانی تم ہو ہم سے تہلیلہ۔ تو خاک سمجھیں تم کو
مرزا غالب		
	(۱)	
شاہ شہید دانش و داد کرے		حق نہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے

یہ دی جو گئی ہے رشتہ عمر میں گا تھ	ہے صفر کہ افزائش اعدا کرے
۲۰	
ان سیم کے بچوں کو کوئی کیا جانے؟	نبیجے ہیں جو ارمغان شیر و لالہ
گن کر دو بیٹے ہم دعائیں سو بار	فیر دزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے
میرائیں	
(۱)	
برساں کوئی کب جو ہر ذاتی کا ہے	ہر گل کو گلہ کم اتفاقی کا ہے
شبنم سے جو دجہ گریہ پوچھی تو کہا	”رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے“
(۲)	
جوشے ہے فنا سے بقا سمجھا ہے	جو چیز ہے کم اُسے سو ابھھا ہے
ہے بحر جہاں میں عمر مانندِ حباب	غافل! اس زندگی کو کیا سمجھا ہے
(۳)	
ہشیار! کہ وقت ساز و برگ آیا ہے	ہنگامِ پنج و نگر آبا ہے
مقتلِ عصا ہوئے تو پیری نے کہا	”چلیے۔ اب چو بد ایر مرگ آیا ہے“
(۴)	
گلشن میں بھروں۔ کہ سیر صحرا دیکھوں	یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جہا تری قدرت کے ہیں لاکھوں چہرے	حیاں ہوں۔ کہ وہ آنکھوں سے کیا دیکھوں
(۵)	
انساں ہی کچھ اس دوزخ میں پامال نہیں	سچ ہے کوئی آسودہ و خوش حالی نہیں

